تفسیر بے نظیر

سورۃ فاتحہ

از

حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی (المسیح الموعود)

ناشر

شعبہ دعوۃ و ارشاد

احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور

بار اول — اکتوبر سنہ ۱۹۷۱ء — تعداد پانچ صد

قیمت تین روپے علاوہ محصول ڈاک — نوائے وقت پریس

ہمارے عقائد

(۱) ہم اللہ تعالیٰ کی توحید اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لاتے ہیں۔

(۲) ہم آنحضرت صلعم کو خاتم النبیین مانتے ہیں اور بالفاظ بانی سلسلہ :۔

"اس بات پر محکم ایمان رکھتا ہوں کہ ہمارے نبی صلعم کے بعد کوئی نبی نہیں آئیگا نیا ہو یا پرانا۔
جو شخص ختم نبوت کا منکر ہو اسے بیدین اور دائرہ اسلام سے خارج سمجھتا ہوں" "بر الیقین ہے
وحی رسالت حضرت آدم صفی اللہ سے شروع ہوئی اور جناب رسول اللہ صلعم پر ختم ہو گئی"۔
"ہم نبوت کے مدعی پر لعنت بھیجتے ہیں"۔

(۳) قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کی آخری اور کامل کتاب مانتے ہیں جس کا کوئی حکم منسوخ نہیں قیامت تک منسوخ ہوگا۔

(۴) ہم آنحضرت صلعم کے بعد مجددین کا آنا مانتے ہیں اور یہ بھی مانتے ہیں کہ اس اُمت میں ایسے لوگ ضرور ہونگے جو حدیث نبویؐ رجال یکلمون من غیران یکونوا انبیاء کے مطابق انبیاء تو نہ ہونگے لیکن اللہ تعالیٰ ان سے یقینی اور قطعی الہام کے ذریعہ سے کلام کرے گا۔

(۵) ہم تمام صحابہ کرام اور تمام ائمہ دین کی عزت کرتے ہیں خواہ وہ اہل سنت کے مسلمہ بزرگ ہوں یا اہل تشیع کے۔ اور کسی صحابی یا امام یا محدث یا مجدد کی تحقیر کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

(۶) ہم ہر اس شخص کو جو لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار کرتا ہے اصولاً مسلمان سمجھتے ہیں خواہ وہ کسی فرقہ سے تعلق رکھتا ہو۔ (۷) ہم حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کو زمانہ کا مجدد، مسیح د مہدی مانتے ہیں نیز انہیں مرتبہ انبیاء کا نہیں بلکہ زمرہ اولیاء کا فرد یقین کرتے ہیں انکے اپنے الفاظ میں نبوت کا دعویٰ نہیں بلکہ محدثیت کا دعویٰ ہے جو خدا تعالیٰ کے حکم سے کیا گیا ہے" "میں نبوت کا مدعی نہیں بلکہ ایسے مدعی کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتا ہوں" "ان لوگوں نے مجھ پر افترا کیا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ یہ شخص نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے" ہاں ہم آپ پر بحیثیت مجدد ہونیکے محض لغوی بروزی مجازی امتی جزوی ناقص نبی کے الفاظ کا اطلاق جائز سمجھتے ہیں جو بالفاظ بانی سلسلہ احمدیہ محدث اور مجدد کے ہم معنی الفاظ ہیں "ہاں محدث جو مرسلین میں سے ہے اُمتی بھی ہوتا ہے اور ناقص طور پر نبی بھی"۔ تا یہ ثابت ہو کہ یہ مقام مجددیت محض حضرت نبی کریم صلعم کے رُوحانی فیض اور آپ کے اتباع کامل کا نتیجہ ہے ۔

سورۃ فاتحہ
کی
نہایت ہی لطیف اور بے نظیر تفسیر



سیدنا حضرت مرزا غلام احمدؑ صاحب قادیانی نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب براہین احمدیہ میں جب قرآن کریم کی بے نظیری کے متعلق دنیا کے سامنے دعویٰ پیش کیا تو پنڈت شو نرائن اگنی ہوتری نے جو اس وقت برہمو سماج کے مشہور لیڈروں میں سے تھے حضورؑ کے اس دعویٰ کی تردید میں ایک بیان شائع کیا جس کے جواب میں حضورؑ نے پنڈت صاحب کے بیان پر جرح کرتے ہوئے اور بے نظیری کے چند اہم اجزاء پر روشنی ڈالتے ہوئے قرآن کریم کی سورۃ الفاتحہ میں ان اجزاء کے وجود کو ثابت کرتے ہوئے پنڈت صاحب اور دیگر مخالفین کو چیلنج کیا کہ وہ کسی ایسی الہامی یا غیر الہامی کتاب کی نشاندہی کریں جو ان حقائق و لطائف پر مشتمل ہو جن پر سورۃ الفاتحہ مشتمل ہے۔ طالبان حق اور سالکین کے لئے یہ تفسیر انشاء اللہ روحانی غذا بہم پہنچانے کا ذریعہ ثابت ہوگی۔

یکے از خادمان مسیح موعود علیہ السلام
خاکسار
شیخ عبدالرحمان مصری

بے نظیری پر دلالت کرنیوالے امور

پھر پنڈت صاحب نے پرچہ دھرم جیون جنوری ۱۸۸۳ء میں یہ دعویٰ کر دیا ہے کہ دانشمند انسان ایسی کتاب تالیف کر سکتا ہے کہ جو کمالات میں مثل قرآن شریف کے یا اس سے بڑھکر ہو اب چونکہ پنڈت صاحب بھی دانشمند ہی ہیں بلکہ اپنی قوم کے ریفارمر اور مصلح ہونے کا دم مارتے ہیں اس لئے یہ بار ثبوت انہیں کے ذمہ ہے۔ کہ وہ ایسی کتاب تالیف کرکے دکھلادیں اور جس طرح قرآن شریف باوجود کمال ایجاز جامع تمام حقائق ودقائق ہے۔ اور جس طرح قرآن شریف باوجود التزام حق اور حکمت اور صداقت کے اعلیٰ درجہ کی فصاحت اور بلاغت پر ہے۔ اور جس طرح قرآن شریف اعلیٰ درجہ کی پیشین گوئیوں اور امور غیبیہ سے بھرا ہوا ہے۔ اور جس طرح قرآن شریف اپنی پاک تاثیروں کی وجہ سے سچے طالبوں کے دلوں کو پاک کرکے آسمانی روشنی سے منور کرتا ہے اور ان میں وہ خاص برکتیں پیدا کرتا ہے کہ جو دوسرے مذہبوں میں نہیں پائی جاتیں۔ جیسا کہ ہم نے ان سب باتوں کو اپنی کتاب میں ثابت کر دیا ہے اور کامل ثبوت دے دیا ہے۔ اسی طور اور شان کی کوئی اور کتاب تالیف کرکے پیش کریں ؎

ندارد کسے با تو ناگفتہ کار
ولیکن چو گفتی دلیلش بیار

انسان کی بے بسی

لیکن ہم پنڈت صاحب پر ظاہر کرتے ہیں کہ کسی انسان کے لئے ہرگز ممکن نہیں کہ وہ امور متذکرہ بالا کو جو طاقت انسانی سے بلند تر ہیں اپنے کلام میں پیدا کر سکے۔

خدا کے کلام میں ان امور کا ہونا ضروری ہے

مگر خدا کے کلام میں ان امور کا جمع ہونا نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے۔ کیونکہ جیسا کہ خدا بے مثل و مانند ہے اسی طرح جو چیز اسی کی طرف سے صادر ہے۔ وہ بھی بے مثل و مانند چاہیئے جس کی نظیر بنانے پر انسان قادر نہ ہو سکے پس قرآن شریف نے جو اپنے کمالات میں بے مثل ہونے کا دعویٰ کیا ہے یہ کوئی بے موقعہ دعویٰ نہیں یہ وہی قانونِ قدرت کا مسئلہ ہے، جس پر چلنا انسان کی دانشمندی ہے۔ جس سے انحراف کرنا حماقت کی نشانی ہے۔

ذرا اپنے ہی دل میں سوچ کر آپ انصافاً فرمایئے کہ خدا کے کلام کا بے نظیر ہونا قانونِ قدرت کے لحاظ سے لازم ہے یا نہیں۔ اگر آپ کے نزدیک لازم نہیں اور خدا کے کاموں میں شرکتِ غیر بھی جائز ہے تو پھر صاف ہی کیوں نہیں کہتے کہ ہم کو خدا کے واحد لاشریک ہونے میں ہی کلام ہے۔ کیا آپ اس بدیہی بات کو سمجھ نہیں سکتے کہ خدا کی وحدانیت تب ہی تک ہے جب تک اس کی تمام صفات شرکتِ غیر سے منزّہ ہیں۔ اگر خدا کے کلام کی یہ حیثیت ہو کہ انسان بھی ایسا ہی کلام بنا سکے تو گویا خدا کی ساری حیثیت معلوم ہو گئی۔ گویا اس کی خدائی کا سارا بھید ہی کھل گیا۔

کس مرتبہ پر پہنچکر کلام بے نظیر ہوتا ہے

اب ہم اس جگہ بغرض فائدہ عام یہ بات بطور قاعدہ کلیہ بیان کرتے ہیں کہ کلام کا وہ کون سا مرتبہ ہے جس مرتبہ پر کوئی کلام واقعہ ہونے سے اس صفت سے متصف ہو جاتا ہے کہ اس کو بے نظیر اور منجانب اللہ کہا جائے اور پھر بطور نمونہ کوئی سورۃ قرآن شریف کی لکھ کر اس میں یہ ثابت کر کے

دکھلائیں گے کہ وہ تمام وجوہ بے نظیری جو قاعدہ کلیہ میں قرار دی گئی ہیں اس سورۃ میں بہ تمام و کمال پائی جاتی ہیں اور اگر کسی کو ان وجوہ بے نظیری کے قبول کرنے میں پھر بھی انکار ہو گا تو بہ بارِ ثبوت اسی کے ذمہ ہو گا کہ کوئی دوسرا کلام پیش کر کے دکھلاوے جس میں وہ تمام وجوہ بے نظیری پائے جائیں ۔

سو واضح ہو کہ اگر کوئی کلام ان تمام چیزوں میں سے کہ جو خدا تعالیٰ کی طرف سے صادر اور اس کے دستِ قدرت کی صنعت ہیں کسی چیز سے مشابہت کلی رکھتا ہو۔ یعنی اس میں عجائباتِ ظاہری و باطنی ایسے طور پر جمع ہوں کہ جو مصنوعاتِ الٰہیہ میں سے کسی شے میں جمع ہیں تو اس صورت میں کہا جائیگا کہ وہ کلام ایسے مرتبہ پر واقع ہے کہ جس کی مثل بنانے سے انسانی طاقتیں عاجز ہیں۔ کیونکہ جس چیز کی نسبت بے نظیر اور صادر من اللہ ہونا عند الخواص والعوام ایک مسلّم اور مقبول امر ہے جس میں کسی کو اختلاف و نزاع نہیں اس کی وجوہ بے نظیری میں کسی شے کی شراکت تامہ ثابت ہونا بلا شبہ اس امر کو ثابت کرتا ہے کہ وہ شے بھی بے نظیر ہی ہے مثلاً اگر کوئی چیز اس چیز سے بکلی مطابق آجائے جو اپنے مقدار میں دس گز ہے۔ تو اس کی نسبت بھی یہ علم صحیح قطعی مفید یقین جازم حاصل ہو گا کہ وہ بھی دس گز ہے ۔

گلاب کی بے نظیری سورۃ فاتحہ کیلئے بطور مثال پیش کیجاتی ہے

اب ہم ان مصنوعاتِ الٰہیہ میں سے ایک لطیف مصنوع کو مثلاً گلاب

کے پھول کو بطور مثال قرار دے کر اس کے وہ عجائبات ظاہری و باطنی
لکھتے ہیں جن کی رُو سے وہ ایسی اعلیٰ حالت پر تسلیم کیا گیا ہے کہ اس کی
نظیر بنانے سے انسانی طاقتیں عاجز ہیں۔ اور پھر اس بات کو ثابت کر کے
دکھلائیں گے کہ ان سب عجائبات سے سورۃ فاتحہ کے عجائبات اور کمالات
ہموزن ہیں بلکہ ان عجائبات کا پلّہ بھاری ہے! ور اس مثال کے اختیار کرنے کا
موجب یہ ہوا کہ ایک مرتبہ اس عاجز نے اپنی نظر کشفی میں سورۃ فاتحہ کو دیکھا
کہ ایک ورق پر لکھی ہوئی اس عاجز کے ہاتھ میں ہے اور ایک ایسی خوبصورت
اور دلکش شکل میں ہے کہ گویا وہ کاغذ جس پر سورۃ فاتحہ لکھی ہوئی ہے سُرخ
سُرخ اور ملائم گلاب کے پھولوں سے اس قدر لدا ہوا ہے کہ جس کا کچھ انتہا
نہیں اور جب یہ عاجز اس سُورۃ کی کوئی آیت پڑھتا ہے تو اس میں
سے بہت سے گلاب کے پھُول ایک خوش آواز کے ساتھ پرواز کر کے اُوپر کی
طرف اُڑتے ہیں اور وہ پھول نہایت لطیف اور بڑے بڑے اور سندر اور
تر و تازہ اور خوشبودار ہیں جن کے اوپر چڑھنے کے وقت دل و دماغ نہایت
معطّر ہو جاتا ہے اور ایک ایسا عالم مستی کا پیدا کرتے ہیں کہ جو اپنی بے مثل
لذّتوں کی کشش سے دنیا و مافیہا سے نہایت درجہ کی نفرت دلاتے ہیں۔
اس مکاشفہ سے معلوم ہوا کہ گلاب کے پھُول کو سورۃ فاتحہ کے ساتھ ایک
رُوحانی مناسبت ہے۔ سو ایسی مناسبت کے لحاظ سے اس مثال کو اختیار
کیا گیا اور مناسب معلوم ہوا کہ اوّل بطور مثال گلاب کے پھول کے عجائبات
کو کہ جو اس کے ظاہر و باطن میں پائے جاتے ہیں لکھا جائے اور پھر بمقابلہ اس

کے عجائبات کے سورۃ فاتحہ کے عجائبات ظاہری و باطنی قلمبند ہوں تا ناظرین
با انصاف کو معلوم ہو کہ جو خوبیاں گلاب کے پھول میں ظاہراً و باطناً پائی
جاتی ہیں جن کے رُو سے اس کی نظیر بنانا عادتاً محال سمجھا گیا ہے۔ اسی طور
پر اور اس سے بہتر خوبیاں سورۃ فاتحہ میں موجود ہیں۔ اور تا اس مثال کے
لکھنے سے اشارہ کشفی پر بھی عمل ہو جائے۔ پس جاننا چاہیئے کہ یہ امر ہر ایک
عاقل کے نزدیک بغیر کسی تردّد اور توقف کے مسلم الثبوت ہے کہ گلاب
کا پھول بھی مثل اور مصنوعات الٰہیہ کے ایسی عمدہ خوبیاں اپنی ذات میں جمع
رکھتا ہے جن کی مثل بنانے پر انسان قادر نہیں اور وہ دو طور کی خوبیاں ہیں
ایک وہ کہ جو اس کی ظاہری صورت میں پائی جاتی
ہیں اور وہ یہ ہیں کہ اس کا رنگ نہایت خوشنما اور خوب ہے۔ اور اس کی خوشبو
نہایت دلآرام اور دلکش ہے اور اس کے ظاہر بدن میں نہایت درجہ کی ملائمت
اور تر و تازگی اور نرمی اور نزاکت اور صفائی ہے۔ اور دوسری وہ خوبیاں
ہیں کہ جو باطنی طور پر حکیم مطلق نے اس میں ڈال رکھی ہیں۔ یعنی وہ خواص کہ جو
اس کے جوہر میں پوشیدہ ہیں اور وہ یہ ہیں۔ کہ وہ مفرّح اور مقوی قلب اور
مسکن صفرا ہے اور تمام قوی اور ارواح کو تقویت بخشتا ہے۔ اور صفرا اور بلغم
رقیق کا مسہل بھی ہے اور اسی طرح معدہ اور جگر اور گردہ اور امعاء اور رحم اور
پھیپھڑہ کو بھی قوت بخشتا ہے۔ اور خفقان حار اور غشی اور ضعف قلب کے
لئے نہایت مفید ہے۔ اور اسی طرح اور کئی امراض بدن کو فائدہ مند ہے۔ پس
انہیں دونوں طور کی خوبیوں کی وجہ سے اس کی نسبت اعتقاد کیا گیا ہے کہ وہ

ایسے مرتبہ کمال پر واقعہ ہے کہ ہرگز کسی انسان کے لئے ممکن نہیں کہ اپنی طرف سے کوئی ایسا پھول بنا دے کہ جو اس پھول کی طرح رنگ میں خوشنما اور خوشبو میں دلکش اور بدن میں نہایت تر و تازہ اور نرم اور نازک اور مصفا ہو۔ اور باوجود اس کے باطنی طور پر تمام وہ خواص بھی رکھتا ہو جو گلاب کے پھول میں پائے جاتے ہیں۔ اور اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیوں گلاب کے پھول کی نسبت ایسا اعتقاد کیا گیا کہ انسانی قوتیں اس کی نظیر بنانے سے عاجز ہیں اور کیوں جائز نہیں کہ کوئی انسان اس کی نظیر بنا سکے۔ اور جو خوبیاں اس کے ظاہر و باطن میں پائی جاتی ہیں وہ مصنوعی پھول میں پیدا کر سکے۔ تو اس سوال کا جواب یہی ہے کہ ایسا پھول بنانا عادتاً ممتنع ہے۔ اور آج تک کوئی حکیم اور فیلسوف کسی ایسی ترکیب سے کسی قسم کی ادویہ کو بہم نہیں پہنچا سکا۔ کہ جن کے باہم مخلوط اور ممزوج کرنے سے ظاہر و باطن میں گلاب کے پھول کی سی صورت اور سیرت پیدا ہو جائے۔

اب سمجھنا چاہیئے کہ یہی وجہ بے نظیری کی سُورۃ فاتحہ میں بلکہ قرآن شریف کے ہر ایک حصہ اقل قلیل میں کہ جو چار آیت سے بھی کم ہو پائی جاتی ہیں۔ پہلے ظاہری صورت پر نظر ڈال کر دیکھو کہ کیسی رنگینی عبارت اور خوش بیانی اور جودت الفاظ اور کلام میں کمال سلاست اور نرمی اور روانگی اور آب و تاب اور لطافت وغیرہ لوازم حسنِ کلام اپنا کامل جلوہ دکھا رہے ہیں۔ ایسا جلوہ کہ جس پر زیادت متصور نہیں اور وحشت کلمات اور تعقید ترکیبات سے بکلی سالم اور بری ہے۔ ہر ایک فقرہ اس کا نہایت فصیح اور بلیغ ہے۔

اور ہر ایک ترکیب اس کی اپنے اپنے موقعہ پر واقعہ ہے! ور ہر ایک قسم کا التزام جس سے حسنِ کلام بڑھتا ہے اور لطافتِ عبارت کھلتی ہے سب اس میں پایا جاتا ہے۔ اور جس قدر حسنِ تقریر کے لئے بلاغت اور خوش بیانی کا اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ ذہن میں آسکتا ہے وہ کامل طور پر اس میں موجود اور مشہود ہے۔ اور جس قدر مطلب کے دل نشین کرنے کیلئے حسنِ بیان درکار ہے وہ سب اس میں مہیا اور موجود ہے اور باوجود اس بلاغت معانی اور التزام کمالیت حسنِ بیان کے صدق اور راستی کی خوشبو سے بھرا ہوا ہے۔ کوئی مبالغہ ایسا نہیں جس میں جھوٹ کی ذرا آمیزش ہو کوئی رنگینی عبارت اس قسم کی نہیں جس میں شاعروں کی طرح[۲] جھوٹ اور ہزل اور فضول گوئی کی بدبو سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ یہ کلام صداقت اور راستی کی لطیف خوشبو سے بھرا ہوا ہے۔ اور پھر اس خوشبو کے ساتھ خوش بیانی اور جودتِ الفاظ اور رنگینی اور صفائی عبارت کو ایسا جمع کیا گیا ہے۔ کہ جیسے گلاب کے پھول میں خوشبو کے ساتھ اس کی خوش رنگی اور صفائی بھی جمع ہوتی ہے یہ خوبیاں تو باعتبار ظاہر کے ہیں اور باعتبار باطن کے اس میں یعنی سورۃ فاتحہ میں یہ خواص ہیں کہ وہ بڑی بڑی امراض روحانی کے علاج پر مشتمل ہے۔ اور تکمیل قوتِ علمی اور عملی کے لئے بہت سا سامان اس میں موجود ہے اور بڑے بڑے بگاڑوں کی اصلاح کرتی ہے! ور بڑے بڑے معارف اور دقائق اور لطائف کہ جو حکیموں اور فلسفیوں کی نظر سے چھپے رہے اس میں مذکور ہیں۔ سالک کے دل کو اس کے پڑھنے سے یقینی قوت بڑھتی ہے۔ اور شک اور شبہ اور ضلالت کی بیماری سے شفا حاصل ہوتی ہے۔ اور بہت سی اعلیٰ

[۲] جھوٹ اور ہزل اور فضول گوئی کی نجاست اور بدبو سے معدوم کیا گیا ہے جس طرح شاعروں کا کلام

درجہ کی صداقتیں اور نہایت باریک حقیقتیں کہ جو تکمیلِ نفس ناطقہ کے لئے
ضروری ہیں اس کے مبارک مضمون میں بھری ہوئی ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ
کمالات بھی ایسے ہیں کہ گلاب کے پھول کے کمالات کی طرح ان میں بھی عادتاً
ممتنع معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی انسان کے کلام میں مجتمع ہوسکیں! اور یہ امتناع
نہ نظری بلکہ بدیہی ہے۔ کیونکہ جن دقائق و معارف عالیہ کو خدائے تعالیٰ نے
عین ضرورت حقہ کے وقت اپنے بلیغ اور فصیح کلام میں بیان فرما کر ظاہری
اور باطنی خوبی کا کمال دکھلایا ہے! اور بڑی نازک شرطوں کے ساتھ دونوں
پہلوؤں ظاہر و باطن کو کمالیت کے اعلیٰ مرتبے تک پہنچایا ہے۔ یعنی اوّل
تو ایسے معارف عالیہ ضروریہ لکھے ہیں کہ جن کے آثار پہلی تعلیموں سے مندرس
اور محو ہو گئے تھے اور کسی حکیم یا فیلسوف نے بھی ان معارف عالیہ پر قدم نہیں
مارا تھا اور پھر ان معارف کو غیر ضروری اور فضول طور پر نہیں لکھا تھا بلکہ ٹھیک
ٹھیک اس وقت اور اس زمانے میں ان کو بیان فرمایا جس وقت حالت موجودہ
زمانے کی اصلاح کے لئے ان کا بیان کرنا ازبس ضروری تھا اور بغیر اُن کے
بیان کرنے کے زمانے کی ہلاکت اور تباہی متصوّر تھی۔ پھر وہ معارف عالیہ ناقص
اور ناتمام طور پر نہیں لکھے گئے بلکہ کماً و کیفاً کامل درجہ پر واقعہ ہیں اور کسی عاقل
کی عقل کوئی ایسی دینی صداقت پیش نہیں کرسکتی۔ جو ان سے باہر رہ گئی ہو۔
اور کسی باطل پرست کا کوئی ایسا وسوسہ نہیں جس کا ازالہ اس کلام میں موجود
نہ ہو۔ ان تمام حقائق و دقائق کے التزام سے کہ جو دوسری طرف ضرورتِ حقہ
کے التزام کے ساتھ وابستہ ہیں فصاحت بلاغت کے ان اعلیٰ کمالات کو

ادا کرنا جن پر زیادت متصور نہ ہو یہ تو نہایت بڑا کام ہے کہ جو بشری طاقتوں سے بداہتہً نظر بلند تر ہے۔ مگر انسان تو ایسا بے ہنر ہے کہ اگر ادنیٰ اور ناکارہ معاملات کو کہ جو حقائق عالیہ سے کچھ تعلق نہیں رکھتے کسی رنگین اور فصیح عبارت میں بہ التزام راست بیانی اور حق گوئی کے لکھنا چاہیئے۔ تو یہ بھی اس کے لئے ممکن نہیں۔ جیسا کہ یہ بات ہر عاقل کے نزدیک نہایت بدیہی ہے کہ اگر مثلاً ایک دوکاندار جو کامل درجہ کا شاعر اور انشا پرداز متصور ہو چاہیئے کہ جو اپنی اس گفتگو کو جو ہر روز اسکو رنگا رنگ کے خریداروں اور معاملہ داروں کے ساتھ کرنی پڑتی ہے کمال بلاغت اور رنگینی عبارت کے ساتھ کیا کرے اور پھر یہ بھی التزام رکھے کہ ہر محل اور ہر موقعہ میں جس قسم کی گفتگو کرنا ضروری ہے، وہی کرے۔ مثلاً جہاں کم بولنا مناسب ہے وہاں کم بولے اور جہاں بہت مغززنی مصلحت ہے وہاں بہت گفتگو کرے۔ اور جب اس میں اور اس کے خریدار میں کوئی بحث آپڑے تو وہ طرز تقریر اختیار کرے جس سے اس بحث کو اپنے مفید مطلب طے کر سکے یا مثلاً ایک حاکم جس کا یہ کام ہے کہ فریقین اور گواہوں کے بیان کو ٹھیک ٹھیک قلمبند کرے اور ہر ایک بیان پر جو جو واقعی اور ضروری طور پر جرح قدح کرنا چاہیئے وہی کرے۔ اور جیسا کہ تنقیح مقدمہ کے لئے شرط ہے اور تفتیش امر متنازعہ فیہ کے لئے قرین مصلحت ہے سوال کے موقع پر سوال اور جواب کے موقع پر جواب لکھے اور جہاں قانونی وجوہ کا بیان کرنا لازم ہو ان کو درست طور پر حسب منشاء قانون بیان کرے اور جہاں واقعات کا بترتیب تمام کھولنا واجب ہو ان کو بہ پابندی ترتیب و صحت کھول دے اور پھر جو کچھ فی الواقعہ اپنی رائے اور بتائید اس

رائے کے وجوہات ہیں ان کو بہ صحت تمام بیان کرے۔ اور باوصف ان تمام التزامات کے فصاحت و بلاغت کے اس اعلیٰ درجہ پر اس کا کلام ہو کہ اس سے بہتر کسی بشر کے لئے ممکن نہ ہو تو اس قسم کی بلاغت کو بہ انجام پہنچانا بہ بداہت ان کے لئے محال ہے۔ سو انسانی فصاحتوں کا یہی حال ہے کہ بجز فضول اور غیر ضروری اور واہیات باتوں کے قدم ہی نہیں اٹھ سکتا۔ اور بغیر جھوٹ اور ہزل کے اختیار کرنے کے کچھ بول ہی نہیں سکتے اور اگر کچھ بولے بھی تو ادھورا۔ ناک ہے تو کان نہیں کان ہیں تو آنکھ ندارد۔ سچ بولے تو فصاحت گئی فصاحت کے پیچھے پڑے تو جھوٹ اور فضول گوئی کے انبار کے انبار جمع کر لئے۔ پیاز کی طرح سب پوست ہی پوست اور بیچ میں کچھ بھی نہیں۔ پس جس صورت میں عقل سلیم صریح حکم دیتی ہے کہ ناکارہ اور خفیف معاملات اور سیدھے سادے واقعات کو بھی ضرورت حقہ اور راستی کے التزام سے رنگین اور بلیغ عبارت میں ادا کرنا ممکن نہیں تو پھر اس بات کا سمجھنا کس قدر آسان ہے کہ معارف عالیہ کو ضرورت حقہ کے التزام کے ساتھ نہایت رنگین اور فصیح عبارت میں جس سے اعلیٰ اور اصفیٰ متصور نہ ہو بیان کرنا بالکل خارق عادت اور بشری طاقتوں سے بعید ہے اور جیسا کہ گلاب کے پھول کی طرح کوئی پھول کہ جو ظاہر و باطن میں اس سے مشابہ ہو بنانا عادتاً محال ہے ایسا ہی یہ بھی محال ہے۔ کیونکہ جب ادنیٰ ادنیٰ امور میں تجربہ صحیحہ شہادت دیتا ہے اور فطرت سلیمہ قبول کرتی ہے کہ انسان اپنی کسی ضروری اور راست راست بات کو خواہ وہ بات کسی معاملہ خرید و فروخت سے متعلق ہو یا تحقیقات عدالت وغیرہ سے تعلق رکھتی ہو۔ جب اس کو اصلح اور انسب طور پر بجالانا چاہے تو یہ بات غیر ممکن ہو جاتی ہے کہ اس کی عبارت خواہ نخواہ ہر محل

ہیں موزون اور مقفیٰ اور فصیح و بلیغ بلکہ اعلیٰ درجہ کی فصاحت اور بلاغت پر ہو۔ تو پھر ایسی تقریر کہ جو علاوہ التزام راستی اور صدق کے معارف اور حقائق عالیہ سے بھی بھری ہوئی اور ضرورتِ حقہ کے رو سے صادر ہو اور تمام حقانی صداقتوں پر محیط ہو اور اپنے منصب اصلاح حالتِ موجودہ اور اتمام حجت اور الزام منکرین میں ایک ذرا فروگذاشت نہ کرتی ہو اور مناظرہ اور مباحثہ کے تمام پہلوؤں کی کماحقہ رعایت رکھتی ہو اور تمام ضروری دلائل اور ضروری براہین اور ضروری تعلیم اور ضروری سوال اور ضروری جواب پر مشتمل ہو۔ کیونکہ باوجود ان مشکلات پیچ در پیچ کے کہ جو پہلی صورت سے صدہا درجہ زیادہ ہیں۔ ایسی فصاحت اور بلاغت کے ساتھ کسی بشر کی تحریریں جمع ہوسکتی ہے کہ وہ بلاغت بھی بے مثل و مانند ہو اور اس مضمون کو اس سے زیادہ فصیح عبارت میں بیان کرنا ممکن نہ ہو۔

یہ تو وہ وجوہ ہیں کہ جو سورۃ فاتحہ اور قرآن شریف میں ایسے طور سے پائی جاتی ہیں جن کو گلاب کے پھول کی وجوہ بے نظیری سے بکلی مطابقت ہے۔ لیکن سورۃ فاتحہ اور قرآن شریف میں ایک اور خاصہ بزرگ پایا جاتا ہے۔ کہ جو اسی کلام پاک سے خاص ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس کو توجہ اور اخلاص سے پڑھنا دل کو صاف کرتا ہے اور ظلماتی پردوں کو اُٹھاتا ہے اور سینے کو منشرح کرتا ہے۔ اور طالب حق کو حضرت احدیت کی طرف کھینچ کر ایسے انوار اور آثار کا مورد کرتا ہے کہ جو مقربان حضرت احدیت میں ہونی چاہیئے اور جن کو انسان کسی دوسرے حیلہ یا تدبیر سے ہرگز حاصل نہیں کرسکتا اور اس روحانی تاثیر کا ثبوت بھی ہم اس کتاب میں دے چکے ہیں۔ اور

اگر کوئی طالب حق ہو تو بالمواجہ ہم اس کی تسلی کرسکتے ہیں اور ہر وقت تازہ بتازہ ثبوت دینے کو طیار ہیں اور نیز اس بات کو بخوبی یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن شریف کا اپنی کلام میں بے مثل و مانند ہونا صرف عقلی دلائل میں محصور نہیں۔ بلکہ زمانہ دراز کا تجربہ صحیحہ بھی اس کا مؤید اور مصدق ہے۔ کیونکہ باوجود اس کے کہ قرآن شریف برابر تیرہ سو برس سے اپنی تمام خوبیاں پیش کر کے ھل من معارض کا نقارہ بجا رہا ہے۔ اور تمام دنیا کو بہ آواز بلند کہہ رہا ہے کہ وہ اپنی ظاہری صورت اور باطنی خواص میں بے مثل و مانند ہے۔ اور کسی جن یا انس کو اس کے مقابلہ یا معارضہ کی طاقت نہیں۔ مگر پھر بھی کسی متنفس نے اس کے مقابلے پر دم نہیں مارا بلکہ اس کی کم سے کم کسی سورۃ مثلاً سورہ فاتحہ کی ظاہری و باطنی خوبیوں کا بھی مقابلہ نہیں کرسکا۔ تو دیکھو اس سے زیادہ بدیہی اور کھلا کھلا معجزہ اور کیا ہوگا کہ عقلی طور پر بھی اس پاک کلام کا بشری طاقتوں سے بلند تر ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اور زمانہ دراز کا تجربہ بھی اس کے مرتبۂ اعجاز پر گواہی دیتا ہے۔ اور اگر کسی کو یہ دونوں طور کی گواہی کہ جو عقل اور تجربہ زمانہ دراز کے رُو سے بہ پایۂ ثبوت پہنچ چکی ہے نامنظور ہو اور اپنے علم اور ہنر پر نازاں ہو یا دُنیا میں کسی ایسے بشر کی انشا پردازی کا قائل ہو کہ جو قرآن شریف کی طرح کوئی کلام بنا سکتا ہے تو ہم جیسا کہ وعدہ کر چکے ہیں کچھ بطور نمونہ حقائق و دقائق سُورۃ فاتحہ کے لکھتے ہیں۔ اس کو چاہیئے کہ بمقابلہ ان ظاہری و باطنی سورۃ فاتحہ کی خوبیوں کے کوئی اپنا کلام پیش کرے لیکن قبل تفصیل حقائق عالیہ

سورۃ فاتحہ کے ہم طول کلام سے کچھ اندیشہ نہ کرکے مکرر بیان کرتے ہیں کہ شخص معارض اس بات کو خوب یاد رکھے کہ جیسا کہ ہم ابھی لکھ چکے ہیں۔ سورۃ فاتحہ میں تمام قرآن شریف کی طرح دو قسم کی خوبیاں کہ جو بے مثل و مانند ہیں پائی جاتی ہیں۔ یعنی ایک ظاہری صورت میں خوبی اور ایک باطنی خوبی ـ

ظاہری خوبی یہ کہ جیسا کہ بارہا ذکر کیا گیا ہے اس کی عبارت میں ایسی رنگینی اور آب و تاب اور نزاکت و لطافت و ملائمت اور بلاغت اور شیرینی اور روانگی اور حسنِ ترتیب پایا جاتا ہے کہ ان معانی کو اس سے بہتر یا اس سے مساوی کسی دوسری فصیح عبارت میں ادا کرنا ممکن نہیں۔ اور اگر تمام دنیا کے انشا پرداز اور شاعر متفق ہو کر یہ چاہیں کہ اسی مضمون کو لے کر اپنے طور سے کسی دوسری فصیح عبارت میں لکھیں کہ جو سورۃ فاتحہ کی عبارت سے مساوی یا اس سے بہتر ہو تو یہ بات بالکل محال اور ممتنع ہے کہ ایسی عبارت لکھ سکیں۔ کیونکہ تیرہ سو برس سے قرآن شریف تمام دنیا کے سامنے اپنی بے نظیری کا دعویٰ پیش کر رہا ہے۔ اگر ممکن ہوتا تو البتہ کوئی مخالف اس کا معارضہ کرکے دکھلاتا حالانکہ ایسے دعوے کے معارضہ نہ کرنے میں تمام مخالفین کی رسوائی اور ذلّت اور قرآن شریف کی شوکت اور عزّت ثابت ہوتی ہے۔ پس چونکہ تیرہ سو برس سے اب تک کسی مخالف نے عبارت قرآنی کی مثل پیش نہیں کی تو اس قدر زمانہ دراز تک تمام مخالفین کا مثل پیش کرنے سے عاجز رہنا اور اپنی نسبت ان تمام رسوائیوں اور ندامتوں

اور لعنتوں کو روا رکھنا کہ جو جھوٹوں اور لاجواب رہنے والوں کی طرف عاید ہوتے ہیں صریح اس بات پر دلیل ہے کہ فی الحقیقۃ ان کی علمی طاقت مقابلہ سے عاجز رہی ہے اور اگر کوئی اس امر کو تسلیم نہ کرے تو یہ بار ثبوت اسی کی گردن پر ہے کہ وہ آپ یا کسی اپنے مددگار سے عبارت قرآن کی مثل بنوا کر پیش کرے۔ مثلاً سورۃ فاتحہ کے مضمون کو لے کر کوئی دوسری فصیح عبارت بنا کر دکھلا دے۔ جو کمال فصاحت و بلاغت میں اس کے برابر ہو سکے۔ اور جب تک ایسا نہ کرے تب تک وہ ثبوت کہ جو مخالفین کے تیرہ سو برس خاموش اور لاجواب رہنے سے اہل حق کے ہاتھ میں ہے۔ کسی طور سے ضعیف الاعتبار نہیں ہو سکتا۔ بلکہ مخالفین کے سینکڑوں برسوں کی خاموشی اور لاجواب رہنے نے اس کو وہ کامل مرتبہ ثبوت کا بخشا ہے کہ جو گلاب کے پھول وغیرہ کو وہ ثبوت بے نظیری کا حاصل نہیں۔ کیونکہ دنیا کے حکیموں اور صنعت کاروں کو کسی دوسری چیز میں اس طور پر معارضہ کے لئے کبھی ترغیب نہیں دی گئی اور نہ اس کی مثل بنانے سے عاجز رہنے کی حالت میں کبھی ان کو یہ خوف دلایا گیا۔ کہ وہ طرح طرح کی تباہی اور ہلاکت میں ڈالے جائیں گے۔ پس ظاہر ہے کہ جس ہدایت اور چمک اور دمک سے قرآن شریف کی بلاغت اور فصاحت کا انسانی طاقتوں سے بلند تر ہونا ثابت ہے۔ اس طرح پر گلاب کی لطافت اور رنگینی وغیرہ کا بے مثل ہونا ہرگز ثابت نہیں۔ پس یہ تو سورۃ فاتحہ اور تمام قرآن شریف کی ظاہری خوبی کا بیان ہے جس میں اس کا بے مثل و مانند ہونا اور بشری طاقتوں سے برتر

ہونا مخالفین کے عاجز رہنے سے پایۂ ثبوت پہنچ گیا ہے اب ہم باطنی خوبیوں کو بھی دوہرا کر ذکر کرتے ہیں۔ تا اچھی طرح غور کرنے والوں کے ذہن میں آجائیں سو جاننا چاہیئے کہ جیسا خداوند حکیم مطلق نے گلاب کے پھول میں بدن انسان کے لئے طرح طرح کے منافع رکھے ہیں۔ کہ وہ دل کو قوت دیتا ہے اور قویٰ اور ارواح کو تقویت بخشتا ہے اور کئی اور مرضوں کو مفید ہے۔ ایسا ہی خداوند کریم نے سورۃ فاتحہ میں تمام قرآن شریف کی طرح رُوحانی مرضوں کی شفا رکھی ہے۔ اور باطنی بیماریوں کا اس میں وہ علاج موجود ہے کہ جو اس کے غیر میں ہرگز نہیں پایا گیا کیونکہ اس میں وہ کامل صداقتیں بھری ہوئی ہیں کہ جو رُوئے زمین سے نابود ہو گئی تھیں۔ اور دنیا میں ان کا نام و نشان باقی نہیں رہا تھا۔ پس وہ پاک کلام فضول اور بے فائدہ طور پر دنیا میں نہیں آیا بلکہ وہ آسمانی نور اس وقت تجلّی فرما ہوا جب کہ دنیا کو اس کی نہایت ضرورت تھی اور ان تعلیموں کو لایا جن کا دُنیا میں پھیلانا دنیا کی اصلاح کے لئے نہایت ضروری تھا۔ غرض جن پاک تعلیموں کی بغایت درجہ ضرورت تھی اور جن معارف و حقائق کے شائع کرنے کی شدّت سے حاجت تھی انہیں ضروری اور لابدی اور حقانی صداقتوں کو عین ضرورت کے وقتوں میں اور ٹھیک ٹھیک حاجت کے موقعہ میں ایک بے مثل بلاغت اور فصاحت کے پیرائے میں بیان فرمایا۔ اور باوصف اس التزام کے جو کچھ گمراہوں کی ہدایت کے لئے اور حالت موجودہ کی اصلاح کے لئے بیان کرنا واجب تھا اس سے ایک ذرہ ترک نہ کیا۔ اور جو کچھ غیر واجب اور فضول اور بیہودہ تھا اس کا کسی فقرے میں کچھ دخل ہونا نہ پایا۔ غرض وہ انوار اور پاک صداقتیں باوصف اس شان عالی

سے کہ جو اُن کو بوجہ اعلیٰ درجہ کے معارف ہونے کے حاصل ہے۔ ایک نہایت درجہ کی عظمت اور برکت یہ رکھتے ہیں۔ کہ وہ عبث اور فضول طور پر ظاہر نہیں کی گئیں۔ بلکہ جن جن اقسام انواع کی ظلمت دنیا میں پھیلی ہوئی تھی اور جس جس قسم کا جہل اور فساد علمی اور عملی اور اعتقادی امور میں حالتِ زمانہ پر غالب آگیا تھا۔ اس ہر ایک قسم کے فساد کے مقابلے پر پورے پورے زور سے ان سب ظلمتوں کو اٹھانے کے لئے اور روشنی کے پھیلانے کے لئے عین ضروری وقت پر بارانِ رحمت کی طرح ان صداقتوں کو دنیا میں ظاہر کیا گیا اور حقیقت میں وہ بارانِ رحمت ہی تھا۔ کہ سخت پیاسوں کی جان رکھنے کے لئے آسمان سے اُترا اور دنیا کی روحانی حیات اسی بات پر موقوف تھی کہ وہ آبِ حیات نازل ہو اور کوئی قطرہ اس کا ایسا نہ تھا کہ کسی موجود الوقت بیماری کی دوا نہ ہو اور حالتِ موجودہ زمانہ نے صدہا سال تک اپنی معمولی گمراہی پر رہ کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ ان بیماریوں کے علاج کو خود بخود بغیر اثر نے اس نور کے حاصل نہیں کر سکتا اور نہ اپنی ظلمت کو آپ اُٹھا سکتا ہے بلکہ ایک آسمانی نور کا محتاج ہے کہ جو اپنی سچائی کی شعاعوں سے دنیا کو روشن کرے اور ان کو دکھا دے جنہوں نے کبھی نہیں دیکھا اور ان کو سمجھا دے جنہوں نے کبھی نہیں سمجھا۔ اس آسمانی نور نے دنیا میں آکر صرف یہی کام نہیں کیا کہ ایسے معارفِ حقہ ضروریہ پیش کئے جن کا صفحہ زمین پر نشان باقی نہیں رہا تھا بلکہ اپنے رُوحانی خاصہ کے زور سے ان جواہر حق اور حکمت کو بہت سے سینوں میں بھر دیا اور بہت سے دلوں کو اپنے دلرُبا چہرے کی طرف کھینچ لایا اور اپنی قوی تاثیر سے بہتوں کو علم اور عمل کے اعلیٰ مقام تک پہنچایا۔

اب یہ دونوں قسم کی خوبیاں کہ جو سورۃ فاتحہ اور تمام قرآن شریف میں پائی جاتی ہیں۔ کلام الٰہی کی بے نظیری ثابت کرنے کے لئے ایسے روشن دلائل ہیں کہ جیسی وہ خوبیاں جو گلاب کے پھول میں سب کے نزدیک انسانی طاقتوں سے اعلیٰ تسلیم کی گئی ہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جس قدر یہ خوبیاں بدیہی طور پر عادت سے خارج اور طاقتِ انسانی سے باہر ہیں۔ اس شان کی خوبیاں گلاب کے پھول میں ہرگز نہیں پائی جاتیں۔ ان خوبیوں کی عظمت اور شوکت اور بے نظیری اس وقت کھلتی ہے جب انسان سب کو من حیث الاجتماع اپنے خیال میں لاوے اور اس اجتماعی ہیئت پر غور اور تدبّر سے نظر ڈالے۔ مثلاً اوّل اس بات کے تصوّر کرنے سے کہ ایک کلام کی عبارت ایسے اعلیٰ درجہ کی فصیح اور بلیغ اور ملائم اور شیریں اور سلیس اور خوش طرز اور رنگین ہو۔ کہ اگر کوئی انسان کوئی ایسی عبارت اپنی طرف سے بنانا چاہے کہ جو تمام و کمال انہیں معانی پر مشتمل ہو کہ جو اس بلیغ کلام میں پائے جاتے ہیں۔ تو ہرگز ممکن نہ ہو کہ وہ انسانی عبارت اس پایۂ بلاغت و رنگینی کو پہنچ سکے۔ پھر ساتھ ہی یہ دوسرا تصوّر کرنے سے کہ اس عبارت کا مضمون ایسے حقائق و دقائق پر مشتمل ہو کہ جو فی الحقیقت اعلیٰ درجہ کی صداقتیں ہوں اور کوئی فقرہ اور کوئی لفظ اور کوئی حرف ایسا نہ ہو کہ جو حکیمانہ بیان پر مبنی نہ ہو۔ پھر ساتھ ہی یہ تیسرا تصوّر کرنے سے کہ وہ صداقتیں ایسی ہوں کہ حالتِ موجودہ زمانہ کو ان کی نہایت ضرورت ہو پھر ساتھ ہی یہ چوتھا تصوّر کرنے سے کہ وہ صداقتیں ایسی بے مثل و مانند ہوں

کہ کسی حکیم یا فیلسوف کا پتہ نہ مل سکتا ہو کہ ان صداقتوں کو اپنی نظر اور فکر
سے دریافت کرنے والا ہو چکا ہو۔ پھر ساتھ ہی یہ پانچواں تصوّر کرنیسے
کہ جس زمانہ میں وہ صداقتیں ظاہر ہوئی ہوں ایک تازہ نعمت کی طرح
ظاہر ہوئی ہوں اور اس زمانہ کے لوگ ان کے ظہور سے پہلے اس راہِ راست
سے بکلی بےخبر ہوں۔ پھر ساتھ ہی یہ چھٹا تصوّر کرنے سے کہ اس کلام میں ایک
آسمانی برکت بھی ثابت ہو کہ جو اس کی متابعت سے طالب حق کو خداوند کریم کے
ساتھ ایک سچا پیوند اور ایک حقیقی اُنس پیدا ہو جائے اور وہ انوار اس میں چمکنے
لگیں کہ جو مردانِ خدا میں چمکنے چاہئیں۔ یہ کل مجموعی ایک ایسی حالت میں
معلوم ہوتا ہے کہ عقل سلیم بلا توقف و تردد حکم دیتی ہے۔ کہ بشری کلام کا
ان تمام مراتب کاملہ پر مشتمل ہونا ممتنع اور محال اور خارق عادت ہے اور
بلاشبہ ان تمام فضائل ظاہری و باطنی کو بہ نظر یکجائی دیکھنے سے ایک
رعب ناک حالت ان میں پائی جاتی ہے۔ کہ جو عقلمند کو اس بات کا یقین دلاتی
ہے۔ کہ اس کل مجموعی کا انسانی طاقتوں سے انجام پذیر ہونا عقل اور قیاس سے
باہر ہے اور ایسی رعب ناک حالت گلاب کے پھول میں ہرگز پائی نہیں جاتی۔
کیونکہ قرآن شریف میں یہ خصوصیت زیادہ ہے کہ اس کی صفات مذکورہ کہ جو
بے نظیری کا مدار ہیں نہایت بدیہی الثبوت ہیں۔ اور اسی وجہ سے جب معارض کو
معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ایک حرف بھی ایسے موقعہ پر نہیں رکھا گیا کہ جو حکمت
اور مصلحت سے دور ہو۔ اس کا ایک فقرہ بھی ایسا نہیں کہ جو زمانہ کی
اصلاح کے لئے اشد ضروری نہ ہو۔ اور پھر بلاغت کا یہ کمال کہ ہرگز

ممکن نہیں کہ اس کی ایک سطر کی عبارت تبدیل کر کے بجائے اس کے کوئی دوسری عبارت لکھ سکیں تو ان بدیہی کمالات کے مشاہدہ کرنے سے معارض کے دل پر ایک بزرگ رعب پڑ جاتا ہے۔ ہاں کوئی نادان جس نے ان باتوں میں کبھی غور نہیں کی شاید بباعثِ نادانی سوال کرے کہ اس بات کا ثبوت کیا ہے کہ یہ ساری خوبیاں سورۃ فاتحہ اور تمام قرآن شریف میں متحقق اور ثابت ہیں۔ سو واضح ہو کہ اس بات کا یہی ثبوت ہے کہ جنہوں نے قرآن شریف کی بے مثل کمالات پر غور کی اور اس کی عبارت کو ایسے اعلیٰ درجے کی فصاحت اور بلاغت پر پایا۔ کہ اس کی نظیر بنانے سے عاجز رہ گئے۔ اور پھر اس کے دقائق وحقائق کو ایسے مرتبے عالیہ پر دیکھا کہ تمام زمانے میں اس کی نظیر نظر نہ آئی۔ اور اس میں وہ تاثیرات عجیبہ مشاہدہ کیں کہ جو انسانی کلمات میں ہرگز نہیں ہوا کرتیں۔ اور پھر اس میں یہ صفت پاک دیکھی کہ وہ بطور ہزل اور فضول گوئی کے نازل نہیں ہوا بلکہ عین ضرورت حقہ کے وقت نازل ہوا۔ تو انہوں نے ان تمام کمالات کے مشاہدہ کرنے سے بے اختیار اس کی بے مثل عظمت کو تسلیم کر لیا! ورانمیں سے جو لوگ بباعثِ شقاوتِ ازلی نعمتِ ایمان سے محروم رہے۔ ان کے دلوں پر بھی اس قدر ہیبت اور رعب اس بے مثل کلام کا پڑا کہ انہوں نے بھی مبہوت اور سراسیمہ ہو کر یہ کہا کہ یہ تو سحر مبین ہے اور پھر منصف کو اس بات سے بھی قرآن شریف کے بے مثل و مانند ہونے پر ایک قوی دلیل ملتی ہے اور روشن ثبوت ہاتھ میں آتا ہے کہ باوجود اس

کہ مخالفین کو تیرہ سو برس سے خود قرآن شریف مقابلہ کرنے کی سخت غیرت دلاتا ہے اور لاجواب رہ کر مخالفت اور انکار کرنے والوں کا نام شریر اور پلید اور لعنتی اور جہنمی رکھتا ہے۔ مگر پھر بھی مخالفین نے نامردوں اور مخنثوں کی طرح کمال بے شرمی اور بے حیائی سے اس تمام ذلّت اور بے آبروئی اور بے عزّتی کو اپنے لئے منظور کیا اور یہ روا رکھا کہ ان کا نام جھوٹا اور ذلیل اور بے حیا اور خبیث اور پلید اور شریر اور بے ایمان اور جہنمی رکھا جاوے مگر ایک قلیل المقدار سورۃ کا مقابلہ نہ کر سکے اور نہ ان خوبیوں اور صفتوں اور عظمتوں اور صداقتوں میں کچھ نقص نکال سکے کہ جن کو کلام الٰہی نے پیش کیا ہے۔ حالانکہ ہمارے مخالفین پر درحالت انکار لازم تھا اور اب بھی لازم ہے کہ اگر وہ اپنے کفر اور بے ایمانی کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ تو وہ قرآن شریف کی کسی سورۃ کی نظیر پیش کریں اور کوئی ایسا کلام بطور معارضہ ہمارے سامنے لاویں کہ جس میں یہ تمام ظاہری و باطنی خوبیاں پائی جاتی ہوں کہ جو قرآن شریف کی ہر ایک اقل قلیل سورت میں پائی جاتی ہیں۔ یعنی عبارت اس کی ایسی اعلیٰ درجے کی بلاغت پر باوصف التزام راستی اور صداقت اور باوصف التزام ضرورت حقہ کے واقعہ ہو کہ ہرگز کسی بشر کے لئے ممکن نہ ہو کہ وہ معانی کسی دوسری ایسی ہی فصیح عبارت میں لا سکے۔ اور مضمون اس کا نہایت اعلیٰ درجہ کی صداقتوں پر مشتمل ہو۔ اور پھر وہ صداقتیں بھی ایسی ہوں کہ فضول طور پر نہ لکھی گئی ہوں بلکہ کمال درجے کی ضرورت نے ان کا لکھنا واجب کیا ہو اور نیز وہ صداقتیں ایسی ہوں

کہ قبل ان کے ظہور کے تمام دنیا ان سے بے خبر ہو اور ان کا ظہور ایک نئی نعمت کی طرح ہو اور پھر ان تمام خوبیوں کے ساتھ ایک یہ رُوحانی خاصہ بھی ان میں موجود ہو کہ قرآن شریف کی طرح اُن میں وہ صریح تاثیریں بھی پائی جائیں جن کا ثبوت ہم نے اس کتاب میں دے دیا ہے اور ہر وقت طالب حق کے لئے تازہ سے تازہ ثبوت دینے کو تیار ہیں۔ اور جب تک کوئی معارض ایسی نظیر پیش نہ کرے تب تک اسی کا عاجز رہنا قرآن شریف کی بے نظیری کو ثابت کرتا ہے۔ اور یہ وجوہ بے نظیری قرآن شریف کی جو اس جگہ لکھے گئے یہ تو ہم نے بطور تنزّل اور کفایت شعاری کے لکھے ہیں اور اگر ہم قرآن شریف کی ان تمام دوسری خوبیوں کو بھی کہ جو اس میں پائی جاتی ہیں نظیر طلب کرنے کے لئے لازمی شرط ٹھہراویں۔ مثلاً اپنے مخالفوں کو یہ کہیں کہ جیسا قرآن شریف تمام حقائق اور معارفِ دینی پر محیط اور مشتمل ہے۔ اور کوئی دینی صداقت اس سے باہر نہیں اور جیسا وہ صدہا امورِ غیبیہ اور پیشگوئیوں پر احاطہ رکھتا ہے اور پیش گوئیاں بھی ایسی قادرانہ کہ جن میں اپنی عزت اور دشمن کی ذلّت اور اپنا اقبال اور دشمن کا ادبار اور اپنی فتح اور دشمن کی شکست پائی جاتی ہے۔ یہ تمام خوبیاں بھی ہمراہ متذکرہ بالا خوبیوں کے اپنے معارضانہ کلام میں پیش کر کے دکھلادیں تو اس شرط سے ان کو تباہی پر تباہی اور موت پر موت آئے گی۔ مگر چونکہ جس قدر پہلے اس سے قرآن شریف کی خوبیاں لکھی گئی ہیں وہی دشمن کور باطن کے ملزم اور لاجواب اور عاجز کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اور انہیں سے ہمارے مخالفوں پر وہ حالت وارد ہو گی جس

مردوں سے پرلے پار ہوجائیں گے۔ اس لئے قرآن شریف کی تمام خوبیوں کو نظیر طلب کرنے کے لئے پیش کرنا غیر ضروری ہے۔ اور نیز تمام خوبیوں کے لکھنے سے کتاب میں بھی بہت ساطول ہوجائے گا۔ سو اسی قدر قتل موذی کے لئے کافی ہتھیار سمجھ کر پیش کیا گیا۔ اب باوصف اس کے کہ یہ تمام تر رعایت و تخفیف قرآن شریف کی کسی اقل قلیل سورۃ کی نظیر مخالفوں سے طلب کی جاتی ہے۔ مگر پھر بھی ہر ایک باخبر آدمی پر ظاہر ہے کہ مخالفین باوجود سخت حرص اور شدت عناد اور پرلے درجے کی مخالفت اور عداوت کے مقابلہ اور معارضہ سے قدیم سے عاجز رہے ہیں اور اب بھی عاجز ہیں۔ اور کسی کو دم مارنے کی جگہ نہیں اور باوجود اس بات کے کہ اس مقابلہ سے ان کا عاجز رہنا ان کو ذلیل بناتا ہے۔ جہنمی ٹھیراتا ہے۔ کافر اور بے ایمان کا ان کو لقب دیتا ہے۔ بے حیا اور بے شرم ان کا نام رکھتا ہے۔ مگر مُردے کی طرح ان کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلتی۔ پس لاجواب رہنے کی ساری ذلّتوں کو قبول کرنا اور تمام ذلیل ناموں کو اپنے لئے روا رکھنا اور تمام قسم کے بے حیائی اور بے شرمی کی خس و خاشاک کو اپنے سر پر اُٹھا لینا اس بات پر نہایت روشن دلیل ہے کہ ان ذلیل چمگادڑوں کی اس آفتاب حقیقت کے آگے کچھ پیش نہیں جاتی۔ پس جبکہ اس آفتاب صداقت کی اس قدر تیز شعاعیں چاروں طرف سے چھوٹ رہی ہیں کہ ان کے سامنے ہمارے دشمن خفاش سیرت اندھے ہو رہے ہیں۔ تو اس صورت میں یہ بالکل مکابرہ اور سخت جہالت ہے کہ گلاب کے پھول کی خوبیوں کو جو بہ نسبت قرآنی

خوبیوں کے ضعیف اور کمزور اور قلیل الثبوت ہیں اس مرتبہ بے نظیری پر سمجھا جائے کہ انسانی قوتیں ان کی مثل بنانے سے عاجز ہیں۔ مگر ان اعلیٰ درجہ کی خوبیوں کو جو کئی درجہ گلاب کے پھول کی ظاہری اور باطنی خوبیوں سے افضل و بہتر اور قوی الثبوت ہیں۔ ایسا خیال کیا جائے کہ گویا انسان ان کی نظیر بنانے پر قادر ہے۔ حالانکہ جس حالت میں انسان میں یہ قدرت نہیں پائی جاتی۔ کہ ایک گلاب کے پھول کی جو صرف ایک ساعت تر و تازہ اور خوشنما نظر آتا ہے۔ اور دُوسری ساعت میں نہایت افسردہ اور پژمردہ اور بدنما ہو جاتا ہے۔ اور اس کا وہ لطیف رنگ اُڑ جاتا ہے اور اس کے پات ایک دوسرے سے الگ ہو کر گر پڑتے ہیں۔ نظیر بنا سکے۔ تو پھر ایسے حقیقی پھول کا مقابلہ کیونکر ہو سکے جس کے لئے مالک ازلی نے بہار جاوداں رکھی ہے۔ اور جس کو ہمیشہ بادِ خزاں کے صدمات سے محفوظ رکھا ہے۔ اور جس کی طراوت اور ملائمت اور حُسن اور نزاکت میں کبھی فرق نہیں آتا اور کبھی افسردگی اور پژمردگی اس کے ذاتِ بابرکات میں راہ نہیں پاتی بلکہ جس قدر پُرانا ہوتا جاتا ہے اسی قدر اس کی تازگی اور طراوت زیادہ سے زیادہ کھُلتی جاتی ہے اور اس کے عجائبات زیادہ سے زیادہ منکشف ہوتے جاتے ہیں۔ اور اس کے حقائق و دقائق لوگوں پر بکثرت ظاہر ہوتے جاتے ہیں تو پھر ایسے حقیقی پھول کے اعلیٰ درجے کے فضائل اور مراتب سے انکار کرنا پرلے درجے کی کور باطنی ہے۔ یا نہیں۔ بہر حال اگر کوئی ایسا ہی نابینا ہو کہ جو اپنی اس کور باطنی سے ان خوبیوں کی نشان عظیم کو نہ سمجھتا ہو تو یہ

بارِ ثبوت اسی نادان کی گردن پر ہے کہ جو کچھ ہم نے بے نظیری کلام الٰہی کا ثبوت دیا ہے اور جس قدر ہم نے وجوہِ متفرقہ سے اس پاک کلام کا انسانی طاقتوں سے بلند تر ہونا بہ پایۂ ثبوت پہنچایا ہے۔ ان سب فضائلِ قرآنی کی نظیر پیش کرے اور کسی انسان کے کلام میں ایسے ہی کمالات ظاہری و باطنی دکھلاوے جن کا کلام الٰہی میں پایا جانا ہم نے ثابت کر دیا ہے۔ اب اتمامِ حجت کے لئے کچھ دقائق و حقائق سورۃ فاتحہ کے ذیل میں لکھے جاتے ہیں۔ مگر اوّل سورۃ فاتحہ کو لکھ کر پھر اس کے معارف عالیہ کا لکھنا شروع کریں گے۔ اور سورۃ فاتحہ یہ ہے :

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

الحمد للّٰہ رب العلمین ○ الرحمن الرحیم ○
مالک یوم الدّین ○ ایّاک نعبد وایّاک نستعین ○
اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ○ صِرَاطَ الَّذِیْنَ
اَنْعَمْتَ علیھم ۵ لا غیرِ المغضوب علیھم و
لَا الضَّآلِّیْنَ ○

اس سورۃ کی تفسیر جس میں کسی قدر بطور نمونہ اس سورۃ کے معارف و حقائق مذکور ہیں ذیل میں لکھے جاتے ہیں :

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یہ آیت سورہ ممدوحہ کی آیتوں میں سے پہلی آیت ہے۔ اور قرآن شریف

کی دوسری سورتوں پر بھی لکھی گئی ہے۔ اور ایک اور جگہ بھی قرآن شریف میں یہ آیت آئی ہے اور جس قدر تکرار اس آیت کا قرآن شریف میں بہ کثرت پایا جاتا ہے اور کسی آیت میں اس قدر تکرار نہیں پایا جاتا۔ اور چونکہ اسلام میں یہ سنت ٹھہر گئی ہے۔ کہ ہر ایک کام کے ابتداء میں جس میں خیر اور برکت مطلوب ہو بطریق تبرک اور استمداد اس آیت کو پڑھ لیتے ہیں۔ اس لئے یہ آیت دشمنوں اور دوستوں اور چھوٹوں اور بڑوں میں شہرت پا گئی ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص تمام قرآنی آیات سے بے خبر مطلق ہو تب بھی امید قوی ہے کہ اس آیت سے ہرگز اس کو بے خبری نہیں ہوگی۔

اب یہ آیت جن کامل صداقتوں پر مشتمل ہے ان کو بھی سن لینا چاہیئے۔ سو منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ اصل مطلب اس آیت کے نزول سے یہ ہے۔ کہ تا عاجز اور بے خبر بندوں کو اس نکتہ معرفت کی تعلیم کی جائے کہ ذات واجب الوجود کا اسم اعظم جو اللہ ہے۔ کہ جو اصطلاح قرآنی ربانی کے رُو سے ذات مستجمع جمیع صفات کاملہ اور منزہ من جمیع رذائل اور معبود برحق اور واحد لاشریک اور مبدء جمیع فیوض پر بولا جاتا ہے۔ اس اسم اعظم کی بہت سی صفات میں سے جو دو صفتیں بسم اللہ میں بیان کی گئی ہیں یعنی صفت رحمانیت و رحیمیت انہیں دو صفتوں کے تقاضا سے کلام الٰہی کا نزول اور اس کے انوار و برکات کا صدور ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ خدا کے پاک کلام کا دنیا میں اُترنا اور بندوں کو اس سے مطلع کیا جانا یہ صفت رحمانیت کا تقاضا ہے۔ کیونکہ صفت رحمانیت کی کیفیت (جیسا کہ آگے بھی تفصیل سے لکھا جائے گا) یہ ہے کہ وہ صفت بغیر سبقت عمل

کسی عامل کے بغیر محض جود اور بخشش الٰہی کے جوش سے ظہور میں آتی ہے جیسا خدا نے سورج اور چاند اور پانی اور ہوا وغیرہ کو بندوں کی بھلائی کے لئے پیدا کیا ہے۔ یہ تمام جود اور بخشش صفتِ رحمانیت کے رُو سے ہے۔ اور کوئی شخص دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یہ چیزیں میرے کسی عمل کی پاداش میں بنائی گئی ہیں۔ اسی طرح خدا کا کلام بھی کہ جو بندوں کی اصلاح اور رہنمائی کے لئے اترا وہ بھی اسی صفت کے رُو سے اُترا ہے اور کوئی ایسا متنفس نہیں کہ یہ دعویٰ کر سکے کہ میرے کسی عمل یا مجاہدہ یا کسی پاک باطنی کے اجر میں خدا کا پاک کلام کہ جو اس کی شریعت پر مشتمل ہے نازل ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ طہارت اور پاک باطنی کا دم مارنے والے اور زہد اور عبادت میں زندگی بسر کرنے والے اب تک ہزاروں لوگ گذرے ہیں۔ لیکن خدا کا پاک اور کامل کلام کہ جو اس کے فرائض اور احکام کو دنیا میں لایا اور اس کے ارادوں سے خلق اللہ کو مطلع کیا انہیں خاص وقتوں میں نازل ہوا ہے کہ جب اس کے نازل ہونے کی ضرورت تھی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ خدا کا پاک کلام انہیں لوگوں پر نازل ہو کہ جو تقدس اور پاک باطنی میں اعلیٰ درجہ رکھتے ہوں کیونکہ پاک کو پلید سے کچھ میل اور مناسبت نہیں لیکن یہ ہرگز ضرور نہیں کہ ہر جگہ تقدس اور پاک باطنی کلام الٰہی کے نازل ہونے کو مستلزم ہو۔ بلکہ خدائے تعالیٰ کی حقانی شریعت اور تعلیم کا نازل ہونا ضروراتِ حقہ سے وابستہ ہے۔ پس جس جگہ ضروراتِ حقہ پیدا ہو گئیں اور زمانے کی اصلاح کے لئے واجب معلوم ہوا کہ کلام الٰہی نازل ہو۔ اسی زمانے میں خدائے تعالیٰ نے جو حکیم مطلق

ہے اپنے کلام کو نازل کیا اور کسی دوسرے زمانہ میں گو لاکھوں آدمی تقویٰ وطہارت
کی صفت سے منتصف ہوں اور گو کیسی ہی تقدس اور پاک باطنی رکھتے ہوں
ان پر خدا کا وہ کامل کلام ہرگز نازل نہیں ہوتا کہ جو شریعت حقانی پر مشتمل
ہو ہاں مکالمات ومخاطبات حضرت احدیت کے بعض پاک باطنوں سے ہو
جاتے ہیں۔ اور وہ بھی اس وقت کہ جب حکمتِ الٰہیہ کے نزدیک ان مکالمات اور
مخاطبات کیلئے کوئی ضرورتِ حقہ پیدا ہو اور ان دونوں طور کی ضرورتوں میں فرق یہ
ہے کہ شریعت حقانی کا نازل ہونا اس ضرورت کے وقت پیش آتا ہے۔
کہ جب دنیا کے لوگ بباعثِ ضلالت اور گمراہی کے جادۂ استقامت سے
منحرف ہو گئے ہوں اور اُن کے راہِ راست پر لانے کے لئے ایک نئی شریعت
کی حاجت ہو کہ جو ان کی آفاتِ موجودہ کا بخوبی تدارک کرسکے اور ان کی تاریکی
اور ظلمت کو اپنے کامل اور شافی بیان کے نور سے بکلی اُٹھا سکے اور جس طور
کا علاج حالتِ فاسدہ زمانہ کے لئے درکار ہے۔ وہ علاج اپنے پُر زور
بیان سے کرسکے لیکن جو مکالمات ومخاطبات اولیاء اللہ کے ساتھ ہوتے ہیں
ان کے لئے غالباً اس ضرورتِ عظمیٰ کا پیش آنا ضروری نہیں بلکہ بسا اوقات
صرف اسی قدر ان مکالمات سے مطلب ہوتا ہے کہ تا ولی کے نفس کو کسی مصیبت
اور محنت کے وقت صبر اور استقامت کے لباس سے متحلی کیا جائے۔ یا کسی
غم اور حزن کے غلبے میں کوئی بشارت اس کو دی جائے۔ مگر وہ کامل اور پاک
کلام خدائے تعالیٰ کا کہ جو نبیوں اور رسولوں پہ نازل ہوتا ہے وہ جیسا کہ
ہم نے ابھی بیان کیا ہے اس ضرورتِ حقہ کے پیش آنے پر تنزول فرماتا ہے

کہ جب خلق اللہ کو اس کے نزول کی بشدت حاجت ہو۔ غرض کلام الٰہی کے نازل ہونے کا اصل موجب ضرورت حقہ ہے۔ جیسا کہ تم دیکھتے ہو کہ جب تمام رات کا اندھیرا ہو جاتا ہے اور کچھ نور باقی نہیں رہتا تو اسی وقت تم سمجھ جاتے ہو کہ اب ماہِ نو کی آمد نزدیک ہے۔ اسی طرح جب گمراہی کی ظلمت سخت طور پر دنیا پر غالب آجاتی ہے تو عقل سلیم اس رُوحانی چاند کے نکلنے کو بہت نزدیک سمجھتی ہے۔ ایسا ہی جب امساکِ باراں سے لوگوں کا حال تباہ ہو جاتا ہے تو اس وقت عقل مند لوگ بارانِ رحمت کا نازل ہونا بہت قریب خیال کرتے ہیں۔ اور جیسا کہ خدا نے اپنے جسمانی قانون میں بھی بعض مہینے برسات کے لئے مقرر کر رکھے ہیں یعنی وہ مہینے جن میں فی الحقیقت مخلوق اللہ کو بارش کی ضرورت ہوتی ہے اور ان مہینوں میں جو مینہ برستا ہے اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاتا کہ خاص ان مہینوں میں لوگ زیادہ نیکی کرتے ہیں اور دُوسرے مہینوں میں فسق و فجور میں مبتلا رہتے ہیں۔ بلکہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ وہ مہینے ہیں۔ جن میں زمینداروں کو بارش کی ضرورت ہے۔ اور جن میں بارش کا ہو جانا تمام سال کی سرسبزی کا موجب ہے۔ ایسا ہی کلام الٰہی کا نزول فرمانا کسی شخص کی طہارت اور تقوٰی کے جہت سے نہیں ہے۔ یعنی علت موجبہ اس کلام کے نزول کی یہ نہیں ہو سکتی کہ کوئی شخص غایت درجہ کا مقدس اور پاک باطن تھا یا راستی کا بھوکا اور پیاسا تھا بلکہ جیسا کہ ہم کئی دفعہ لکھ چکے ہیں۔ کتب آسمانی کے نزول کا اصلی موجب ضرورت حقہ ہے یعنی وہ ظلمت اور

تاریکی کہ جو دنیا پر طاری ہو کر ایک آسمانی نور کو چاہتی ہے کہ تا وہ نور نازل ہو کر اس تاریکی کو دُور کرے۔ اور اسی کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ جو خدائے تعالیٰ نے اپنے پاک کلام میں فرمایا ہے :

اِنَّا انزلناہ فِی لیلۃ القدر

یہ لیلۃ القدر اگرچہ اپنے مشہور معنوں کے رُو سے ایک بزرگ رات ہے لیکن قرآنی اشارات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی ظلمانی حالت بھی اپنی پوشیدہ خوبیوں میں لیلۃ القدر کا ہی حکم رکھتی ہے اور اس ظلمانی حالت کے دنوں میں صدق اور صبر اور زہد اور عبادت خدا کے نزدیک بڑا قدر رکھتا ہے۔ اور وہی ظلمانی حالت تھی جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بعثت کے وقت تک اپنے کمال کو پہنچ کر ایک عظیم الشان نور کے نزول کو چاہتی تھی۔ اور اسی ظلمانی حالت کو دیکھ کر اور ظلمت زدہ بندوں پر رحم کر کے صفتِ رحمانیت نے جوش مارا اور آسمانی برکتیں زمین کی طرف متوجہ ہوئیں۔ سو وہ ظلمانی حالت دنیا کے لئے مبارک ہو گئی۔ اور دنیا نے اس سے ایک عظیم الشان رحمت کا حصّہ پایا۔ کہ ایک کامل انسان اور سیّد الرسل کہ جس سا کوئی پیدا نہ ہوا اور نہ ہوگا۔ دنیا کی ہدایت کے لئے آیا۔ اور دنیا کے لئے اس روشن کتاب کو لایا جس کی نظیر کسی آنکھ نے نہیں دیکھی پس یہ خدا کی کمال رحمانیت کی ایک بزرگ تجلی تھی۔ کہ جو اس نے ظلمت اور تاریکی کے وقت ایسا عظیم الشان نور نازل کیا جس کا نام فرقان ہے جو حق اور باطل میں فرق کرتا ہے۔ جس نے حق کو موجود اور باطل کو نابود

کر کے دکھلا دیا۔ وہ اس وقت زمین پر نازل ہوئی جب زمین ایک موت رُوحانی کے ساتھ مر چکی تھی اور بر اور بحر میں ایک بھاری فساد واقعہ ہو چکا تھا۔ پس اُس نے نزول فرما کر وہ کام کر دکھلایا جس کی طرف اللہ تعالےٰ نے آپ اشارہ فرما کر کہا ہے اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِہَا یعنی زمین مر گئی تھی اب خدا اس کو نئے سرے سے زندہ کرتا ہے۔ اب اس بات کو بخوبی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ یہ نزول قرآن شریف کا کہ جو زمین کو زندہ کرنے کے لئے ہُوا۔ یہ صفت رحمانیت کے جوش سے ہوا وہی صفت ہے کہ جو کبھی جسمانی طور پر جوش مار کر قحط زدوں کی خبر لیتی ہے۔ اور بارانِ رحمت خشک زمین پر برساتی ہے۔ اور وہی صفت کبھی رُوحانی طور پر جوش مار کر ان بھوکوں اور پیاسوں کی حالت پر رحم کرتی ہے کہ جو ضلالت اور گمراہی کی موت تک پہنچ جاتے ہیں اور حق اور صداقت کی غذا کہ جو رُوحانی زندگی کا موجب ہے۔ ان کے پاس نہیں رہتی۔ پس رحمان مطلق جیسا جسم کی غذا کو اس کی حاجت کے وقت عطا فرماتا ہے۔ ایسا ہی وہ اپنی رحمت کاملہ کے تقاضا سے رُوحانی غذا کو بھی ضرورت حقہ کے وقت مہیا کر دیتا ہے ہاں یہ بات درست ہے کہ خدا کا کلام انہیں برگزیدہ لوگوں پر نازل ہوتا ہے۔ جن سے خدا راضی ہے۔ اور انہیں سے وہ مکالمات اور مخاطبات کرتا ہے جن سے وہ خوش ہے۔ مگر یہ بات ہرگز درست نہیں کہ جس سے خدا راضی اور خوش ہو اس پر خواہ مخواہ بغیر کسی ضرورت حقہ کے کتاب آسمانی نازل ہو جایا کرے۔ یا خدائے تعالیٰ یوں ہی بلا ضرورتِ حقہ

کسی کی طہارت لازمی کی وجہ سے لازمی اور دائمی طور پر اس سے ہر وقت باتیں کرتا ہے۔ بلکہ خدا کی کتاب اسی وقت نازل ہوتی ہے جب فی الحقیقت اس کے نزول کی ضرورت پیش آجائے۔ اب خلاصہ کلام یہ ہے کہ وحی اللہ کے نزول کا اصل موجب خدائے تعالیٰ کی رحمانیت ہے کسی عامل کا عمل نہیں اور یہ ایک بزرگ صداقت ہے جس سے ہمارے مخالف برہمو وغیرہ بے خبر ہیں۔

پھر بعد اس کے سمجھنا چاہیئے کہ کسی فرد انسانی کا کلام الٰہی کے فیض سے فی الحقیقۃ مستفیض ہو جانا۔ اور اس کی برکات اور انوار سے متمتع ہو کر منزل مقصود تک پہنچنا اور اپنی سعی اور کوشش کے ثمرہ کو حاصل کرنا یہ حقیقت رحیمیت کی تائید سے وقوع میں آتا ہے۔ اور اسی جہت سے خدائے تعالیٰ نے بعد ذکر صفت رحمانیت کے صفت رحیمیت کو بیان فرمایا تا معلوم ہو کہ کلام الٰہی کی تاثیریں جو نفوس انسانیت میں ہوتی ہیں یہ حقیقت رحیمیت کا اثر ہے۔ جس قدر کوئی اعراض صوری و معنوی سے پاک ہو جاتا ہے جس قدر کسی کے دل میں خلوص اور صدق پیدا ہو جاتا ہے۔ جس قدر کوئی جدوجہد سے متابعت اختیار کرتا ہے۔ اسی قدر کلام الٰہی کی تاثیر اس کے دل پر ہوتی ہے۔ اور اسی قدر وہ اس کے انوار سے متمتع ہوتا ہے اور علامات خاصہ مقبولان الٰہی کی اس میں پیدا ہو جاتی ہیں۔

دوسری صداقت کہ جو بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ میں مودع ہے یہ ہے کہ یہ آیت قرآن شریف کے شروع کرنے کے لئے نازل ہوئی ہے۔

اور اس کے پڑھنے سے مدّعا یہ ہے کہ تا اس ذات مستجمع جمیع صفات کاملہ سے مدد طلب کی جائے جس کی صفتوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ رحمان ہے اور طالب حق کے لئے محض تفضل اور احسان سے اسباب خیر اور برکت اور رشد کے پیدا کر دیتا ہے۔ اور دُوسری صفت یہ ہے کہ وہ رحیم ہے یعنی سعی اور کوشش کرنے والوں کی کوششوں کو ضائع نہیں کرتا۔ بلکہ ان کے جدوجہد پر ثمراتِ حسنہ مترتب کرتا ہے۔ اور ان کی محنت کا پھل ان کو عطا فرماتا ہے۔
اور یہ دونوں صفتیں یعنی رحمانیت اور رحیمیت ایسی ہیں کہ بغیر ان کے کوئی کام دنیا کا ہو یا دین کا انجام کو پہنچ نہیں سکتا۔ اور اگر غور کر کے دیکھو تو ظاہر ہوگا کہ دنیا کی تمام مہمات کے انجام دینے کے لئے یہ دونوں صفتیں ہر وقت اور ہر لحظہ کام میں لگی ہوئی ہیں۔ خدا کی رحمانیت اس وقت سے ظاہر ہو رہی ہے کہ جب انسان ابھی پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ سو وہ رحمانیت انسان کے لئے ایسے ایسے اسباب بہم پہنچاتی ہے کہ جو اس کی طاقت سے باہر ہیں۔ اور جن کو وہ کسی حیلہ یا تدبیر سے ہرگز حاصل نہیں کر سکتا۔ اور وہ اسباب کسی عمل کی پاداش میں نہیں دیئے جاتے۔ بلکہ تفضل اور احسان کی راہ سے عطا ہوتے ہیں جیسے نبیوں کا آنا کتابوں کا نازل ہونا۔ بارشوں کا ہونا۔ سورج اور چاند اور ہوا اور بادل وغیرہ کا اپنے اپنے کاموں میں لگے رہنا اور خود انسان کا طرح طرح کی قوتوں اور طاقتوں کے ساتھ مشرف ہو کر اس دنیا میں آنا اور تندرستی اور امن اور فرصت اور ایک کافی مدت تک عمر پانا یہ وہ سب امور ہیں کہ جو صفت رحمانیت کے تقاضا سے ظہور میں آتے ہیں۔ اسی طرح خدا کی رحیمیت

تب ظہور کرتی ہے کہ جب انسان سب توفیقوں کو پاکر خداداد قوتوں کو کسی فعل کے انجام کے لئے حرکت دیتا ہے۔ اور جہاں تک اپنا زور اور طاقت اور قوت ہے اُسے خرچ کرتا ہے۔ تو اس وقت عادتِ الٰہیہ اس طرح پر جاری ہے کہ اس کی کوششوں کو ضائع ہونے نہیں دیتا۔ بلکہ ان کوششوں پر ثمراتِ حسنہ مترتب کرتا ہے پس یہ اس کی سراسر رحیمیت ہے کہ جو انسان کی مردہ محنتوں میں جان ڈالتی ہے۔ اب جاننا چاہیئے کہ آیت ممدوحہ کی تعلیم سے مطلب یہ ہے کہ قرآن شریف کے شروع کرنے کے وقت اللہ تعالیٰ کی ذات جامع صفات کاملہ کی رحمانیت اور رحیمیت سے استمداد اور برکت طلب کی جائے۔ صفت رحمانیت سے برکت طلب کرنا اس غرض سے ہے کہ تا وہ ذاتِ کامل اپنی رحمانیت کی وجہ سے ان سب اسباب کو محض لطف اور احسان سے میسر کر دے کہ جو کلام الٰہی کی متابعت میں جد و جہد کرنے سے پہلے درکار ہیں۔ جیسے عمر کا وفا کرنا۔ فرصت اور فراغت کا حاصل ہونا۔ وقت صفا میسّر آجانا۔ طاقتوں اور قوتوں کا قائم ہونا۔ کوئی ایسا امر پیش نہ آجانا کہ جو آسائش اور امن میں خلل ڈالے۔ کوئی ایسا مانع نہ آپڑنا۔ کہ جو دل کو متوجہ ہونے سے روک دے۔ غرض ہر طرح سے توفیق عطا کئے جانا۔ یہ سب امور صفت رحمانیت سے حاصل ہوتے ہیں۔ اور صفت رحیمیت سے برکت طلب کرنا اس غرض سے ہے کہ تا وہ ذاتِ کامل اپنی رحیمیت کی وجہ سے انسان کی کوششوں پر ثمراتِ حسنہ مترتب کرے۔ اور انسان کی محنتوں کو ضائع ہونے سے بچادے اور اس کی سعی اور جد و جہد کے بعد اس کے کام میں برکت ڈالے۔ پس اس طور پر خدائے تعالیٰ کی دونوں صفتوں رحمانیت اور

رحیمیت سے کلام الٰہی کے شروع کرنے کے وقت بلکہ ہر ایک ذی شان کام کے ابتدا میں تبرک اور استمداد چاہتا۔ یہ نہایت اعلیٰ درجہ کی صداقت ہے جس سے انسان کو حقیقت توحید کی حاصل ہوتی ہے۔ اور اپنے جہل اور بے خبری اور نادانی اور گمراہی اور عاجزی اور خواری پر یقین کامل ہو کر مبدءِ فیض کی عظمت اور جلال پر نظر جا ٹھہرتی ہے۔ اور اپنے تئیں بکلی مفلس اور مسکین اور ہیچ اور ناچیز سمجھ کر خداوند قادر مطلق سے اس کی رحمانیت اور رحیمیت کی برکتیں طلب کرتا ہے اور اگرچہ خدا تعالیٰ کی یہ صفتیں خود بخود اپنے کام میں لگی ہوئی ہیں۔ مگر اس حکیم مطلق نے قدیم سے انسان کے لئے یہ قانون قدرت مقرر کر دیا ہے کہ اس کی دعا اور استمداد کو کامیابی میں بہت سا دخل ہے۔ جو لوگ اپنی مہمات میں دلی صدق سے دُعا مانگتے ہیں اور ان کی دُعا پورے پورے اخلاص تک پہنچ جاتی ہے تو ضرور فیضان الٰہی ان کی مشکل کشائی کی طرف توجہ کرتا ہے۔ ہر ایک انسان جو اپنی کمزوریوں پر نگاہ کرتا ہے۔ اور اپنے قصوروں کو دیکھتا ہے وہ کسی کام پر آزادی اور خود بینی سے ہاتھ نہیں ڈالتا۔ بلکہ سچی عبودیت اس کو یہ سمجھاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کہ جو متصرف مطلق ہے، اس سے مدد طلب کرنی چاہیئے۔ یہ سچی عبودیت کا جوش ہر ایک ایسے دل میں پایا جاتا ہے کہ جو اپنی فطرتی سادگی پر قائم اور اپنی کمزوری پر اطلاع رکھتا ہے۔ پس صادق آدمی جس کی روح میں کسی قسم کے غرور اور عجب نے جگہ نہیں پکڑی اور جو اپنے کمزور اور ہیچ اور بے حقیقت وجود پر خوب واقف ہے اور اپنے تئیں کسی کام کے انجام دینے کے لائق نہیں پاتا اور اپنے نفس میں کچھ قوت اور طاقت نہیں دیکھتا جب کسی کام کو شروع

کرتا ہے تو بلا تصنع اُس کی کمزور رُوح آسمانی قوت کی خواستگار رہتی ہے۔ اور ہر وقت اس کو خدا کی مقتدر ہستی اپنے سارے کمال و جلال کے ساتھ نظر آتی ہے۔ اور اس کی رحمانیت اور رحیمیت ہر ایک کام کے انجام کے لئے مدار دکھلائی دیتی ہے۔ پس وہ بلا ساختہ اپنا ناقص اور ناکارہ زور ظاہر کرنے سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی دُعا سے امداد الٰہی چاہتا ہے پس اس انکسار اور فروتنی کی وجہ سے اُس لائق ہو جاتا ہے۔ کہ خدا کی قوت سے قوت اور خدا کی طاقت سے طاقت اور خدا کے علم سے علم پاوے۔ اور اپنی مرادات میں کامیابی حاصل کرے۔ اس بات کے ثبوت کے واسطے کسی منطق یا فلسفہ کے دلائل پر از تکلف درکار نہیں ہیں۔ بلکہ ہر ایک انسان کی رُوح میں اس کے سمجھنے کی استعداد موجود ہے۔ اور عارفِ صادق کے اپنے ذاتی تجارب اس کی صحت پر بہ تواتر شہادت دیتے ہیں۔ بندہ کا خدا سے امداد چاہنا کوئی ایسا امر نہیں ہے جو صرف بیہودہ اور بناوٹ ہو یا جو صرف بے اصل خیالات پر مبنی ہو۔ اور کوئی معقول نتیجہ اس پر مترتب نہ ہو بلکہ خداوند کریم کہ جو فی الحقیقت قیوم عالم ہے اور جس کے سہارے پر سچ سچ اُس عالم کی کشتی چل رہی ہے۔ اس کی عادتِ قدیمہ کی رُو سے یہ صداقت قدیم سے چلی آتی ہے کہ جو لوگ اپنے تئیں حقیر اور ذلیل سمجھ کر اپنے کاموں میں اس کا سہارا طلب کرتے ہیں اور اس کے نام سے اپنے کاموں کو شروع کرتے ہیں۔ تو وہ اُن کو اپنا سہارا دیتا ہے۔ جب وہ ٹھیک ٹھیک اپنی عاجزی اور عبودیت سے رُو بخدا ہو جاتے ہیں اس کی تائیدیں ان کے شامل حال ہو جاتی ہیں۔ غرض ہر ایک شاندار کام کے شروع میں اس مبداءِ فیوض کے نام سے مدد چاہنا کہ جو رحمان

ورحیم ہے۔ ایک نہایت ادب اور عبودیت اور نیستی اور تفقر کا طریقہ ہے۔ اور ایسا ضروری طریقہ ہے کہ جس سے توحید فی الاعمال کا پہلا زینہ شروع ہوتا ہے جس کے التزام سے انسان بچوں کی سی عاجزی اختیار کرکے ان نخوتوں سے پاک ہوجاتا ہے۔ کہ جو دنیا کے مغرور دانشمندوں کے دلوں میں بھری ہوتی ہیں۔ اور پھر اپنی کمزوری اور امدادِ الٰہی پر یقین کامل کرکے اس معرفت سے حصّہ پالیتا ہے کہ جو خاص اہل اللہ کو دی جاتی ہے۔ اور بلاشبہ جس قدر انسان اس طریقہ کو لازم پکڑتا ہے جس قدر اس پر عمل کرنا اپنا فرض ٹھہرا لیتا ہے۔ جس قدر اس کے چھوڑنے میں اپنی ہلاکت دیکھتا ہے۔ اسی قدر اس کی توحید صاف ہوتی ہے۔ اور اسی قدر عجب اور خود بینی کی آلائشوں سے پاک ہوتا جاتا ہے۔ اور اسی قدر تکلف اور بناوٹ کی سیاہی اس کے چہرے پر سے اُٹھ جاتی ہے اور سادگی اور بھولاپن کا نور اس کے منہ پر چمکنے لگتا ہے۔ پس یہ وہ صداقت ہے کہ جو رفتہ رفتہ انسان کو فنا فی اللہ کے مرتبہ تک پہنچاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ دیکھتا ہے کہ میرا کچھ بھی اپنا نہیں بلکہ سب کچھ مَیں خدا سے پاتا ہوں۔ جہاں کہیں یہ طریق کسی نے اختیار کیا وہیں توحید کی خوشبو پہلی دفعہ میں ہی اس کو پہنچنے لگتی ہے۔ اور دل اور دماغ کا معطر ہونا شروع ہوجاتا ہے۔ بشرطیکہ قوت شامہ میں کچھ فساد نہ ہو۔ غرض اس صداقت کے التزام میں طالب صادق کو اپنے ہیچ اور بے حقیقت ہونے کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ اور اللہ جل شانہٗ کے متصرف مطلق اور مبدءِ فیوض ہونے پر شہادت دینی پڑتی ہے۔ اور یہ دونوں ایسے امر ہیں کہ جو حق کے طالبوں کا مقصود ہیں اور

مرتبہ فنا کے حاصل کرنے کے لئے ایک ضروری شرط ہے۔ اسی ضروری شرط کے سمجھنے کے لئے یہی مثال کافی ہے کہ بارش اگرچہ عالمگیر ہو مگر تاہم اس پر پڑتی ہے کہ جو بارش کے موقعہ پر آ کھڑا ہوتا ہے۔ اسی طرح جو لوگ طلب کرتے ہیں وہی پاتے ہیں اور جو ڈھونڈتے ہیں انہیں کو ملتا ہے۔ جو لوگ کسی کام کے شروع کرنے کے وقت اپنے ہُنر یا عقل یا طاقت پر بھروسہ رکھتے ہیں اور خدائے تعالیٰ پر بھروسہ نہیں رکھتے وہ اس ذاتِ قادرِ مطلق کا کہ جو اپنی قیومی کے ساتھ تمام عالم پر محیط ہے کچھ قدر شناخت نہیں کرتے اور ان کا ایمان اس خشک ٹہنی کی طرح ہوتا ہے جس کو اپنے شاداب اور سرسبز درخت سے کچھ علاقہ نہیں رہا۔ اور جو ایسی خشک ہو گئی ہے کہ اپنے درخت کی تازگی اور پھول اور پھل سے کچھ بھی حصّہ حاصل نہیں کر سکتی۔ صرف ظاہری جوڑ ہے جو ذراسی جنبش ہوا سے یا کسی اور شخص کے ہلانے سے ٹوٹ سکتی ہے۔ پس ایسا ہی خشک فلسفیوں کا ایمان ہے۔ کہ جو قیوم عالم کے سہارے پر نظر نہیں رکھتے اور اس مبدءِ فیوض کو جس کا نام اللہ ہے ہر ایک طرفۃ العین کے لئے اور ہر حال میں اپنا محتاج الیہ قرار نہیں دیتے۔ پس یہ لوگ حقیقی توحید سے ایسے دُور پڑے ہوئے ہیں جیسے نور سے ظلمت دُور ہے۔ انہیں یہ سمجھ ہی نہیں کہ اپنے تئیں ہیچ اور لاشے سمجھ کر قادرِ مطلق کی طاقت عظمیٰ کے نیچے آ پڑنا عبودیت کے مراتب کی آخری حد ہے۔ اور توحید کا انتہائی مقام ہے جس سے فنا اتم کا چشمہ جوش مارتا ہے اور انسان اپنے نفس اور اس

کے ارادوں سے بالکل کھویا جاتا ہے اور سچے دل سے خدا کے تصرّف پر ایمان لاتا ہے۔ اس جگہ ان خشک فلسفیوں کے اس مقولہ کو بھی کچھ چیز نہیں سمجھنا چاہیئے کہ جو کہتے ہیں کہ کسی کام کے شروع کرنے میں استمداد الٰہی کی کیا حاجت ہے۔ خدا نے ہماری فطرت میں پہلے سے طاقتیں ڈال رکھی ہیں۔ پس ان طاقتوں کے ہوتے ہوئے پھر دوبارہ خدا سے طاقت مانگنا تحصیل حاصل ہے۔ کیونکہ ہم کہتے ہیں کہ بے شک یہ بات سچ ہے کہ خدائے تعالیٰ نے بعض افعال کے بجالانے کے لئے کچھ کچھ ہم کو طاقتیں بھی دی ہیں۔ مگر پھر بھی اس قیوم عالم کی حکومت ہمارے سر پر سے دُور نہیں ہوئی۔ اور وہ ہم سے الگ نہیں ہوا۔ اور اپنے سہارے سے ہم کو جدا کرنا نہیں چاہا۔ اور اپنے فیوض غیر متناہی سے ہم کو محروم کرنا روا نہیں رکھا۔ جو کچھ ہم کو اس نے دیا ہے۔ وہ ایک امر محدود ہے۔ اور جو کچھ اس سے مانگا جاتا ہے۔ اس کی نہایت نہیں۔ علاوہ اس کے جو کام ہماری طاقت سے باہر ہیں۔ ان کے حاصل کرنے کے لئے کچھ بھی ہم کو طاقت نہیں دی گئی اب اگر غور کر کے دیکھو اور ذرا پوری فلسفیت کو کام میں لاؤ۔ تو ظاہر ہو گا کہ کامل طور پر کوئی بھی طاقت ہم کو حاصل نہیں۔ مثلاً ہماری بدنی طاقتیں ہماری تندرستی پر موقوف ہیں۔ اور ہماری تندرستی بہت سے ایسے اسباب پر موقوف ہے کہ کچھ ان میں سے سماوی اور کچھ ارضی ہیں۔ اور وہ سب کی سب ہماری طاقت سے بالکل باہر ہیں۔ اور یہ تو ہم نے ایک موٹی سی بات عام لوگوں کی سمجھ کے موافق کہی ہے۔ لیکن جس قدر درحقیقت وہ قیوم عالم اپنی علت العلل

ہونے کی وجہ سے ہمارے ظاہر اور ہمارے باطن اور ہمارے اوّل اور ہمارے آخر اور ہمارے فوق اور ہمارے تحت اور ہمارے یمین اور ہمارے یسار اور ہمارے دل اور ہماری جان اور ہمارے رُوح کی تمام طاقتوں پر احاطہ کر رہا ہے۔ وہ ایک ایسا مسئلہ دقیق ہے۔ جس کے کُنہ تک عقول بشریہ پہنچ ہی نہیں سکتیں۔ اور اس کے سمجھانے کی اس جگہ ضرورت بھی نہیں کیونکہ جس قدر ہم نے اوپر لکھا ہے وہی مخالف کے الزام اور افہام کے لئے کافی ہے۔ غرض قیوم عالم کے فیوض حاصل کرنے کا یہی طریق ہے کہ اپنی ساری قوت اور زور اور طاقت سے اپنا بچاؤ طلب کیا جائے اور یہ طریق کچھ نیا طریق نہیں ہے بلکہ یہ وہی طریق ہے جو قدیم سے بنی آدم کی فطرت کے ساتھ لگا چلا آتا ہے۔ جو شخص عبودیت کے طریقے پر چلنا چاہتا ہے وہ اسی طریق کو اختیار کرتا ہے اور جو شخص خدا کے فیوض کا طالب ہے وہ اسی راستے پر قدم مارتا ہے۔ اور جو شخص مورد رحمت ہونا چاہتا ہے وہ انہیں قوانین قدیمہ کی تعمیل کرتا ہے۔ یہ قوانین کچھ نئے نہیں ہیں یہ عیسائیوں کے خدا کی طرح کچھ مستحدث بات نہیں بلکہ خدا کا یہ ایک قانون محکم ہے کہ جو قدیم سے بندھا ہوا چلا آتا ہے۔ اور سنت اللہ ہے کہ جو ہمیشہ سے جاری ہے جس کی سچائی کثرتِ تجارب سے ہر ایک طالب صادق پر روشن ہے اور کیونکر روشن نہ ہو ہر عاقل سمجھ سکتا ہے کہ ہم لوگ کس حالت ضعف اور ناتوانی میں پڑے ہوئے ہیں اور بغیر خدا کی مددوں کے کیسے نکمے اور ناکارہ ہیں۔ اگر ایک ذات متصرف مطلق ہر لحظہ اور

ہر دم ہماری خبر گیراں نہ ہو اور پھر اس کی رحمانیت اور رحیمیت ہماری کارسازی نہ کرے تو ہمارے سارے کام تباہ ہو جائیں۔ بلکہ ہم آپ ہی فنا کار اسنہ لیں پس اپنے کاموں کو خصوصاً آسمانی کتاب کو کہ جو سب امور عظیمہ سے ادق اور الطف ہے۔ خداوند قادر مطلق کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے بہ نیت تبرک و استمداد شروع کرنا ایک ایسی بدیہی صداقت ہے۔ کہ بلا اختیار ہم اس کی طرف کھینچے جاتے ہیں۔ کیونکہ فی الحقیقت ہر ایک برکت اسی راہ سے آتی ہے۔ کہ وہ ذات جو متصرف مطلق اور علت العلل اور تمام فیوض کا مبدء ہے جس کا نام قرآن شریف کی اصطلاح میں اللہ ہے۔ خود متوجہ ہو کر اوّل اپنی صفت رحمانیت کو ظاہر کرے ہے اور جو کچھ قبل از سعی درکار ہے اس کو محض اپنے تفضل اور احسان سے بغیر توسط عمل کے ظہور میں لاوے پھر جب وہ صفت رحمانیت کی اپنے کام کو بہ تمام و کمال کر چکے۔ اور انسان توفیق پا کر اپنی قوتوں کے ذریعے سے محنت اور کوشش کا حق بجا لاوے۔ تو پھر دوسرا کام اللہ تعالیٰ کا یہ ہے کہ اپنی صفت رحیمیت کو ظاہر کرے۔ اور جو کچھ بندہ نے محنت اور کوشش کی ہے اس پر نیک ثمرہ مترتب کرے۔ اور اس کی محنتوں کو ضائع ہونے سے بچا کر گوہر مراد عطا فرماوے اسی صفت ثانی کی رُو سے کہا گیا ہے کہ جو ڈھونڈھتا ہے پاتا ہے جو مانگتا ہے اس کو دیا جاتا ہے۔ جو کھٹکھٹاتا ہے اس کے واسطے کھولا جاتا ہے یعنی خدا تعالیٰ اپنی صفت رحیمیت سے کسی کی محنت اور کوشش کو ضائع ہونے نہیں دیتا۔ اور آخر جوئندہ یابندہ ہو جاتا ہے۔ غرض یہ صداقتیں ایسی بیّن الظہور

ہیں کہ ہر ایک شخص خود تجربہ کر کے ان کی سچائی کو شناخت کر سکتا ہے اور کوئی انسان ایسا نہیں کہ بشرط کسی قدر عقلمندی کے یہ بدیہی صداقتیں اس پر چھپی رہیں۔ ہاں یہ بات ان عام لوگوں پر نہیں کھلتی کہ جو دلوں کی سختی اور غفلت کی وجہ سے صرف اسباب معتادہ پر ان کی نظر ٹھیری رہتی ہے۔ اور جو ذات متصرف فی الاسباب ہے اس کے تصرفات لطیفہ پر ان کو علم حاصل نہیں ہوتا۔ اور نہ ان کی عقل اس قدر وسیع ہوتی ہے کہ جو اس بات کو سوچ لیں کہ ہزارہا بلکہ بے شمار ایسے اسباب سماوی و ارضی انسان کے ہر ایک جسم کی آرائش کے لئے درکار ہیں۔ جن کا بہم پہنچنا ہرگز انسان کے اختیار اور قدرت میں نہیں بلکہ ایک ہی ذات مستجمع صفات کاملہ ہے کہ جو تمام اسباب کو آسمانوں کے اوپر سے زمینوں کے نیچے تک پیدا کرتا ہے۔ اور ان پر بہر طور تصرّف اور قدرت رکھتا ہے۔ مگر جو لوگ عقلمند ہیں وہ اس بات کو بلا تردّد بلکہ بدیہی طور پر سمجھتے ہیں۔ اور جو اُن سے بھی اعلیٰ اور صاحب تجربہ ہیں وہ اس مسئلہ میں حق الیقین کے مرتبے تک پہنچے ہوئے ہیں لیکن یہ شبہ کرنا کہ یہ استعانت بعض اوقات کیوں بے فائدہ اور غیر مفید ہوتی ہے۔ اور کیوں خدا کی رحمانیت اور رحیمیت ہر ایک وقت استعانت میں تجلی نہیں فرماتی۔ پس یہ شبہ صرف ایک صداقت کی غلط فہمی ہے۔ کیونکہ خدائے تعالےٰ ان دعاؤں کو کہ جو خلوص کے ساتھ کی جائیں ضرور سنتا ہے۔ اور جس طرح مناسب ہو وہ مدد چاہنے والوں کے لئے مدد بھی کرتا ہے۔ مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ انسان کی استمداد اور دعائیں خلوص نہیں ہوتا نہ انسان دلی عاجزی کے ساتھ

امدادالٰہی چاہتا ہے اور نہ اس کی روحانی حالت درست ہوتی ہے بلکہ اس کے ہونٹوں میں دعا اور اس کے دل میں غفلت یا ریا ہوتی ہے۔ یا کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خدا اس کی دعا کو سُن تو لیتا ہے اور اس کے لئے جو کچھ اپنی حکمتِ کاملہ کے رُو سے مناسب اور اصلح دیکھتا ہے عطا بھی فرماتا ہے لیکن نادان انسان خدا کی ان الطافِ خفیہ کو شناخت نہیں کرتا اور بباعث اپنے جہل اور بے خبری کے شکوہ اور شکایت شروع کر دیتا ہے اور اس آیت کے مضمون کو نہیں سمجھتا وعسیٰ اَن تکرھوا شیئًا وھو خیر لکم وعسیٰ اَن تحبّوا شیئًا وھو شر لکم واللہ یعلم وانتم لاتعلمون یعنی یہ ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو بُری سمجھو اور وہ اصل میں تمہارے لئے اچھی ہو اور ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو دوست رکھو اور وہ اصل میں تمہارے لئے بُری ہو اور خدا چیزوں کی اصل حقیقت کو جانتا ہے، اور تم نہیں جانتے۔

اب ہماری اس تمام تقریر سے واضح ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کس قدر عالی شان صداقت ہے جس میں حقیقی توحید اور عبودیت اور خلوص میں ترقی کرنے کا نہایت عمدہ سامان موجود ہے جس کی نظیر کسی اور کتاب میں نہیں پائی جاتی۔ اور اگر کسی کے زعم میں پائی جاتی ہے تو وہ اس صداقت کو مع تمام دوسری صداقتوں کے جو ہم نیچے لکھتے ہیں نکال کر پیش کرے۔

اس جگہ بعض کوتاہ اندیش اور نادان دشمنوں نے ایک اعتراض بھی بسم اللہ کی بلاغت پر کیا ہے۔ ان معترضین میں سے ایک صاحب تو پادری عماد الدین نام ہیں جس نے اپنی کتاب ہدایت المسلمین میں اعتراض

مندرجہ ذیل لکھا ہے۔ دُوسرے صاحب باوا نرائن سنگھ نام وکیل امرتسری ہیں جنہوں نے پادری کے اعتراض کو سچ سمجھ کر اپنے دلی عناد کے تقاضا کی وجہ سے وہی پوچ اعتراض اپنے رسالہ ودیا پرکاشک میں درج کر دیا ہے۔ سو ہم اس اعتراض کو معہ جواب اس کے کے لکھنا مناسب سمجھتے ہیں۔ تا منصفین کو معلوم ہو کہ فرطِ تعصب نے ہمارے مخالفین کو کس درجہ کی کور باطنی اور نابینائی تک پہنچا دیا ہے کہ جو نہایت درجہ کی روشنی ہے وہ ان کو تاریکی دکھائی دیتی ہے۔ اور جو اعلیٰ درجہ کی خوشبو ہے وہ اس کو بدبو تصور کرتے ہیں۔ سو اب جاننا چاہیئے کہ جو اعتراض بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی بلاغت پر مذکورہ بالا لوگوں نے کیا ہے وہ یہ ہے کہ الرحمٰن الرحیم جو بسم اللہ میں واقع ہے۔ یہ فصیح طرز پر نہیں۔ اگر الرحیم الرحمٰن ہوتا تو یہ فصیح اور صحیح طرز تھی۔ کیونکہ خدا کا نام رحمان باعتبار اس رحمت کے ہے کہ جو اکثر اور عام ہے۔ اور رحیم کا لفظ بہ نسبت رحمان کے اس رحمت کے لئے آتا ہے کہ جو قلیل اور خاص ہے اور بلاغت کا کام یہ ہے کہ قلت سے کثرت کی طرف انتقال ہو۔ نہ یہ کہ کثرت سے قلت کی طرف۔

یہ اعتراض ہے کہ ان دونوں صاحبوں نے اپنی آنکھیں بند کر کے اس کلام پر کیا ہے جس کلام کی بلاغت کو عرب کے تمام اہل زبان جن میں بڑے بڑے شاعر بھی تھے باوجود سخت مخالفت کے تسلیم کر چکے ہیں۔ بلکہ بڑے بڑے معاند اس کلام کی شانِ عظیم سے نہایت درجہ تعجب میں پڑ گئے اور اکثر ان میں سے کہ جو فصیح اور بلیغ کلام کے اسلوب کو بخوبی جاننے پہچاننے والے اور مذاقِ سخن سے عارف اور باانصاف تھے۔ وہ طرزِ قرآنی کو طاقتِ انسانی سے

باہر دیکھکر ایک معجزہ عظیم یقین کر کے ایمان لے آئے جن کی شہادتیں جا بجا قرآن شریف میں درج ہیں اور جو لوگ سخت کور باطن تھے اگرچہ وہ ایمان نہ لائے۔ مگر سراسیمگی اور حیرانی کی حالت میں ان کو بھی کہنا پڑا کہ یہ سحر عظیم ہے جس کا مقابلہ نہیں ہو سکتا چنانچہ ان کا یہ بیان بھی فرقان مجید کے کئی مقام میں موجود ہے۔ اب اسی کلام معجز نظام پر ایسے لوگ اعتراض کرنے لگے جن میں سے ایک تو وہ شخص ہے جس کو دو سطریں عربی کی بھی صحیح اور بلیغ طور پر لکھنے کا ملکہ نہیں۔ اور اگر کسی اہل زبان سے بات چیت کرنے کا اتفاق ہوا تو بجز ٹوٹے پھوٹے اور بے ربط اور غلط فقروں کے کچھ بول نہ سکے اور اگر کسی کو شک ہو تو امتحان کر کے دیکھ لے۔ اور دوسرا وہ شخص ہے جو علم عربی سے بکلی بے بہرہ بلکہ فارسی بھی اچھی طرح نہیں جانتا۔ اور افسوس کہ عیسائی مقدم الذکر کو یہ بھی خبر نہیں کہ یورپ کے اہل علم کہ جو اس کے بزرگ اور پیشرو ہیں جن کا پورٹ صاحب وغیرہ انگریزوں نے ذکر کیا ہے۔ وہ خود قرآن شریف کے اعلیٰ درجہ کی بلاغت کے قائل ہیں۔ اور پھر دانا کو زیادہ تر اس بات پر غور کرنی چاہیئے کہ جب ایک کتاب جو خود ایک اہل زبان پر ہی نازل ہوئی ہے اور اس کی کمال بلاغت پر تمام اہل زبان بلکہ سبعہ معلقہ کے شعرا جیسے اتفاق کر چکے ہیں۔ تو کیا ایسی مسلم الثبوت کلام کسی نادان اجنبی و تزولیدہ زبان والے کے انکار سے جو کہ لیاقت فن سخن سے محض بے نصیب اور تو غل علوم عربیہ سے بالکل بے بہرہ بلکہ کسی ادنی عربی آدمی کے مقابلے پر بولنے سے عاجز ہے۔ قابل اعتراض ٹھہر سکتا ہے بلکہ ایسے لوگ جو اپنی حیثیت سے بڑھ کر بات کرتے ہیں خود اپنی نادانی دکھلاتے ہیں۔ اور یہ

نہیں سمجھتے کہ اہل زبان کی شہادت کے برخلاف اور بڑے بڑے نامی شاعروں کی گواہی کے مخالف کوئی نکتہ چینی کرنا حقیقت میں اپنی جہالت اور غیر فطرتی دکھلانا ہے۔ بھلا عماد الدین پادری کسی عربی آدمی کے مقابلے پر کسی دینی یا دنیوی معاملے میں ذرا ایک آدھ گھنٹے تک ہم کو بول کر تو دکھا دے تا اوّل یہی لوگوں پر کھلے کہ اس کو سیدھی سادی اور بامحاورہ اہل عرب کے مذاق پر بات چیت کرنی آتی ہے یا نہیں۔ کیونکہ ہم کو یقین ہے کہ اس کو ہرگز نہیں آتی اور ہم بہ یقین تمام جانتے ہیں کہ اگر ہم کسی عربی آدمی کو اس کے سامنے بولنے کے لئے پیش کریں تو وہ عربوں کی طرح اور ان کے مذاق پر ایک چھوٹا سا قصہ بھی بیان نہ کر سکے اور جہالت کے کیچڑ میں پھنسا رہ جائے۔ اور اگر شک ہے تو اس کو قسم ہے کہ آزما کر دیکھ لے اور ہم خود اس بات کے ذمہ دار ہیں کہ اگر پادری عماد الدین صاحب ہم سے درخواست کریں تو ہم کوئی عربی آدمی بہم پہنچا کر کسی مقررہ تاریخ پر ایک جلسہ کریں گے جس میں چند لائق ہندو ہوں گے۔ اور چند مولوی مسلمان بھی ہوں گے اور عماد الدین صاحب کو لازم ہوگا کہ وہ بھی چند عیسائی بھائی اپنے ساتھ لے آویں اور پھر سب حاضرین کے روبرو اوّل عماد الدین صاحب کوئی قصہ جو اسی وقت ان کو بتلایا جائے گا عربی زبان میں بیان کریں۔ اور پھر وہی قصہ وہ عربی صاحب کہ جو مقابل پر حاضر ہوں گے اپنی زبان میں بیان فرماویں۔ پھر اگر منصفوں نے یہ رائے دے دی کہ عماد الدین صاحب نے ٹھیک ٹھیک عربوں کے مذاق پر عمدہ اور لطیف تقریر کی ہے تو ہم تسلیم کر لیں گے کہ ان کا اہل زبان پر نکتہ چینی کرنا کچھ جائے تعجب نہیں بلکہ اسی وقت پچاس روپے

نقد بطور انعام ان کو دیئے جائیں گے لیکن اگر اس وقت عماد الدین صاحب بجائے فصیح اور بلیغ تقریر کے اپنے ژولیدہ اور غلط بیان کی بدبو پھیلانے لگے یا اپنی رسوائی اور نالیاقتی سے ڈر کر کسی اخبار کے ذریعے سے یہ اطلاع بھی نہ دی کہ میں ایسے مقابلے کے لئے حاضر ہوں تو پھر ہم بجز اس کے کہ لعنت اللہ علی الکاذبین کہیں اور کیا کہہ سکتے ہیں اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اگر عماد الدین صاحب تولد ثانی بھی پاویں تب بھی وہ کسی اہل زبان کا مقابلہ نہیں کر سکتے ۔پھر جس حالت میں وہ عربوں کے سامنے بھی بول نہیں سکتے ۔ اور فی الفور گونگا بننے کے لئے طیار ہیں ۔ تو پھر ان عیسائیوں اور آریوں کی ایسی سمجھ پر ہزار حیف اور دو ہزار لعنت ہے ۔کہ جو ایسے نادان کی تالیف پر اعتماد کر کے اس بے مثل کتاب کی بلاغت پر اعتراض کرتے ہیں کہ جس نے سید العرب پر نازل ہو کر عرب کے تمام فصیحوں اور بلیغوں سے اپنی عظمت شان کا اقرار کرایا ۔ اور جس کے نازل ہونے سے سبعہ معلقہ مکہ کے دروازہ پر سے اتارا گیا ۔اور معلقہ مذکورہ کے شاعروں میں سے جو شاعر اس وقت بقید حیات تھا وہ بلا توقف اس کتاب پر ایمان لے آیا ۔پھر دوسرا افسوس یہ کہ اس نادان عیسائی کو اب تک یہ بھی خبر نہیں کہ بلاغت حقیقی اس امر میں محدود نہیں کہ قلیل کو کثیر پر ہر جگہ اور ہر محل میں خواہ نخواہ مقدم رکھا جائے بلکہ اصل قاعدہ بلاغت کا یہ ہے کہ اپنے کلام کو واقعی صورت اور مناسب وقت کا آئینہ بنایا جاوے ۔سو اس جگہ بھی رحمان کو رحیم پر مقدم کرنے میں کلام کو واقعی صورت اور ترتیب کا آئینہ بنایا گیا ہے ۔چنانچہ اس ترتیب طبعی کا مفصل

ذکر ابھی سورۃ فاتحہ کی آیتوں میں آوے گا اور اب ہم سورۃ ممدوحہ کی دوسری آیتوں کو تفصیل سے لکھتے ہیں اور وہ یہ ہے :

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ

"تمام محامد اس ذات معبود برحق مستجمع جمیع صفات کاملہ کو ثابت ہیں۔ جس کا نام اللہ ہے۔ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ قرآن شریف کی اصطلاح میں اللہ اس ذات کامل کا نام ہے کہ جو معبود برحق اور مستحق جمیع صفات کاملہ اور تمام رذائل سے منزہ اور واحد لاشریک اور مبدء جمیع فیوض ہے کیونکہ خدائے تعالیٰ نے اپنے کلام پاک قرآن شریف میں اپنے نام اللہ کو تمام دوسرے اسماء وصفات کا موصوف ٹھہرایا ہے اور کسی جگہ کسی دوسرے اسم کو یہ رتبہ نہیں دیا۔ پس اللہ کے اسم کو بوجہ موصوفیت تامہ ان تمام صفتوں پر دلالت ہے جن کا وہ موصوف ہے۔ اور چونکہ وہ جمیع اسماء اور صفات کا موصوف ہے۔ اس لئے اس کا مفہوم یہ ہوا کہ وہ جمیع صفات کاملہ پر مشتمل ہے پس خلاصہ مطلب الحمد للہ کا یہ نکلا کہ تمام اقسام حمد کے کیا باعتبار ظاہر کے اور کیا باعتبار باطن کے اور کیا باعتبار ذاتی کمالات کے اور کیا باعتبار قدرتی عجائبات کے اللہ سے مخصوص ہیں اور اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں اور نیز جس قدر محامد صحیحہ اور کمالات تامہ کو عقل کسی عاقل کی سوچ سکتی ہے۔ یا فکر کسی متفکر کا ذہن میں لا سکتا ہے وہ سب خوبیاں اللہ تعالیٰ میں موجود ہیں۔ اور کوئی ایسی خوبی نہیں کہ عقل اس خوبی کے امکان پر شہادت دے۔ مگر اللہ تعالیٰ بد قسمت انسان کی طرح اس

خوبی سے محروم ہو بلکہ کسی عاقل کی عقل ایسی خوبی پیش ہی نہیں کر سکتی کہ جو خدا میں نہ پائی جائے۔ جہاں تک انسان زیادہ سے زیادہ خوبیاں سوچ سکتا ہے وہ سب اس میں موجود ہیں اور اس کو اپنی ذات وصفات اور محامد میں من کل الوجوہ کمال حاصل ہے۔ اور رذائل سے بکلی منزہ ہے! جس سے سچا اور جھوٹا مذہب ظاہر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ تمام مذہبوں پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ بجز اسلام دنیا میں کوئی بھی ایسا مذہب نہیں ہے کہ جو خدا تعالیٰ کو جمیع رذائل سے منزہ اور تمام محامد کاملہ سے متصف سمجھتا ہو۔ عام ہندو اپنے دیوتاؤں کو کارخانہ ربوبیت میں شریک سمجھتے ہیں۔ اور خدا کے کاموں میں ان کو مستقل طور پر دخیل قرار دیتے ہیں۔ بلکہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ خدا کے ارادوں کو بدلنے والے اور اس کی تقدیروں کو زیر وزبر کرنے والے ہیں۔ اور نیز ہندو لوگ کئی انسانو اور دوسرے جانوروں کی نسبت بلکہ بعض ناپاک اور نجاست خور حیوانات یعنی خنزیر وغیرہ کی نسبت یہ خیال کرتے ہیں کہ کسی زمانے میں ان کا پرمیشر ایسی ایسی جونوں میں تولد پاکر ان تمام آلائشوں اور آلودگیوں سے ملوث ہوتا رہا ہے۔ کہ جو ان چیزوں کے عائد حال ہیں اور نیز انہیں چیزوں کی طرح بھوک اور پیاس اور درد اور دکھ اور خوف وغم اور بیماری اور موت اور ذلت اور رسوائی اور عاجزی اور ناتوانی کی آفات میں گرفتار ہوتا رہا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ تمام اعتقادات خدائے تعالیٰ کی خوبیوں میں دھبہ لگاتے ہیں۔ اور اس کے ازلی وابدی جاہ وجلال کو گھٹاتے ہیں۔ اور آریہ سماج

والے جو اُن کے تہذیب بھائی نکلے ہیں۔ جن کا یہ گمان ہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک وید کی لکیر پہ چلتے ہیں وہ خدائے تعالیٰ کو خالقیت سے بھی جواب دیتے ہیں اور تمام روحوں کو اس کی ذات کامل کی طرح غیر مخلوق اور واجب الوجود اور موجود بوجود حقیقی قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ عقل سلیم خدائے تعالیٰ کی نسبت صریح بہ نقص سمجھتی ہے کہ وہ دنیا کا مالک کہلا کر پھر کسی چیز کا رب اور خالق نہ ہو اور دنیا کی زندگی اس کے سہارے سے نہیں بلکہ اپنے ذاتی وجوب کے رُو سے ہو۔ اور جب عقل سلیم کے آگے یہ دونوں سوال پیش کئے جائیں کہ آیا خداوند قادر مطلق کے محامد تامہ کے لئے یہ بات اصلح اور انسب ہے کہ وہ آپ ہی اپنی قدرت کاملہ سے تمام موجودات کو منصۂ ظہور میں لا کر ان سب کا رب اور خالق ہو۔ اور تمام کائنات کا سلسلہ اس کی ربوبیت تک ختم ہوتا ہو اور پیدائیش اور موت کے نقصان سے پاک ہو یا یہ باتیں اس کی شان کے لائق ہیں۔ کہ جس قدر مخلوقات اس کے قبضہ تصرف میں ہیں۔ یہ چیزیں اس کی مخلوق نہیں ہیں۔ اور نہ ہی اس کے سہارے سے اپنا وجود رکھتی ہیں۔ اور نہ اپنے وجود اور بقا میں اس کی محتاج ہیں اور نہ وہ ان کا خالق اور رب ہے۔ اور نہ خالقیت کی صفت اور قدرت اس میں پائی جاتی ہے اور نہ پیدائیش اور موت کے نقصان سے پاک ہے تو ہرگز عقل یہ فتوی نہیں دیتی کہ وہ جو دنیا کا مالک ہے وہ دنیا کا پیدا کنندہ نہیں۔ اور ہزاروں پُر حکمت صفتیں کہ جو رُوحوں اور جسموں میں پائی جاتی ہیں۔ وہ

اور خالقیت کی صفت اور قدرت اسی کی ذات کامل میں موجود ہے

خود بخود ہیں۔ اور ان کا بنانے والا کوئی نہیں اور خدا جو ان سب چیزوں کا مالک کہلاتا ہے وہ فرضی طور پر مالک ہے۔ اور نہ یہ فتویٰ دیتی ہے کہ اس کو پیدا کرنے سے عاجز سمجھا جاوے یا ناطاقت اور ناقص ٹھہرایا جاوے۔ یا پلیدی اور نجاست خواری کی نالائق اور قبیح عادت کو اس کی طرف منسوب کیا جاوے۔ یا موت اور درد اور دُکھ اور بے علمی اور جہالت کو اس پر روا رکھا جاوے بلکہ صاف شہادت دیتی ہے کہ خدا تعالیٰ ان تمام رزیلتوں اور نقصانوں سے پاک ہونا چاہیئے۔ اور اس میں کمال تام چاہیئے اور کمال تام قدرت تام سے مشروط ہے۔ اور جب خدا تعالیٰ میں قدرت تام نہ رہی اور نہ وہ کسی دوسری چیز کو پیدا کر سکا اور نہ اپنی ذات کو ہر ایک قسم کے نقصان اور عیب سے بچا سکا تو اُس میں کمالِ تام بھی نہ رہا۔ اور جب کمال تام نہ رہا تو محامدِ کاملہ سے وہ بے نصیب رہا۔ یہ ہندوؤں اور آریوں کا حال ہے۔ اور جو کچھ عیسائی لوگ خدائے تعالیٰ کا جلال ظاہر کر رہے ہیں۔ وہ ایک ایسا امر ہے کہ صرف ایک ہی سوال سے دانا انسان سمجھ سکتا ہے یعنی اگر کسی دانا سے پوچھا جائے کہ کیا اس ذاتِ کامل اور قدیم اور غنی اور بے نیاز کی نسبت جائز ہے کہ باوجود اس کے کہ وہ اپنے تمام عظیم الشان کاموں میں جو قدیم سے وہ کرتا رہا ہے آپ ہی کافی ہو۔ آپ ہی بغیر حاجت کسی باپ یا بیٹے کے تمام دنیا کو پیدا کیا ہو اور آپ ہی تمام روحوں اور جسموں کو وہ قوتیں بخشی ہوں جن کی انہیں حاجت ہے۔ اور آپ ہی تمام کائنات کا حافظ اور قیوم اور مدبر ہو۔

بلکہ ان کے وجود سے پہلے جو کچھ ان کو زندگی کے لئے درکار تھا وہ سب اپنی صفتِ
رحمانیت سے ظہور میں لایا اور بغیر انتظار عمل کسی عامل کے سورج اور چاند اور
بے شمار ستارے اور زمین اور ہزار ہا نعمتیں جو زمین پر پائی جاتی ہیں محض
اپنے فضل و کرم سے انسانوں کے لئے پیدا کی ہوں اور ان سب کاموں میں
کسی بیٹے کا محتاج نہ ہوا ہو۔ لیکن پھر وہی کامل خدا آخری زمانے میں
اپنا تمام جلال اور اقتدار کالعدم کر کے مغفرت اور نجات دینے کے لئے
بیٹے کا محتاج ہو جائے اور پھر بیٹا بھی ایسا ناقص بیٹا جس کو باپ سے
کچھ بھی مناسبت نہیں جس نے باپ کی طرح نہ کوئی گوشہ آسمان کا اور نہ
کوئی قطعہ زمین کا پیدا کیا جس سے اس کی الوہیت ثابت ہو۔ بلکہ مرقس
کے ۸ باب ۱۲۔ آیت میں اس کی عاجزانہ حالت کو اس طرح بیان کیا
ہے کہ اس نے اپنے دل سے آہ کھینچ کر کہا کہ اس زمانے کے لوگ کیوں
نشان چاہتے ہیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اس زمانے کے لوگوں کو
کوئی نشان دیا نہ جائے گا۔ اور اس کے مصلوب ہونے کے وقت بھی
یہودیوں نے کہا کہ اگر وہ اب ہمارے روبرو زندہ ہو جائے تو ہم ایمان
لائیں گے۔ لیکن اس نے ان کو زندہ ہو کر نہ دکھلایا۔ اور اپنی خدائی اور
قدرتِ کاملہ کا ایک ذرّہ ثبوت نہ دیا۔ اور اگر بعض معجزات بھی دکھلائے
تو وہ دکھلائے کہ اس سے پہلے اور نبی بکثرت دکھلا چکے تھے بلکہ اُسی
زمانے میں ایک حوض کے پانی سے بھی ایسے ہی عجائبات ظہور میں آتے
تھے (دیکھو باب ۵ انجیل۔ یوحنا)

غرض وہ اپنے خدا ہونے کا کوئی نشان دکھلا نہ سکا۔ جیسا کہ آیت مذکورہ بالا میں خود اُس کا اقرار موجود ہے۔ بلکہ ایک ضعیفہ عاجزہ کے پیٹ سے تولّد پاکر (بقول عیسائیوں) وہ ذلت اور رسوائی اور ناتوانی اور خواری عمر بھر دیکھی کہ جو انسانوں میں سے وہ انسان دیکھتے ہیں کہ جو بد قسمت اور بے نصیب کہلاتے ہیں۔ اور پھر مدّت تک ظلمت خانہ رحم میں قید رہ کر اور اس ناپاک راہ سے کہ جو پیشاب کی بدررو ہے پیدا ہو کر ہر ایک قسم کی آلودہ حالت کو اپنے اوپر وارد کر لیا۔ اور بشری آلودگیوں اور نقصانوں میں سے کوئی ایسی آلودگی باقی نہ رہی جس سے وہ بیٹا باپ کا بدنام کنندہ ملوّث نہ ہوا۔ اور پھر اُس نے اپنی جہالت اور بے علمی اور بے قدرتی اور نیز اپنے نیک نہ ہونے کا اپنی کتاب میں آپ ہی اقرار کر لیا۔ اور پھر درصورتیکہ وہ عاجز بندہ کہ خواہ نخواہ خدا کا بیٹا قرار دیا گیا بعض بزرگ نبیوں سے فضائلِ علمی اور عملی میں کم بھی تھا اور اُس کی تعلیم بھی ایک ناقص تعلیم تھی۔ کہ جو موسیٰ کی شریعت کی ایک فرع تھی۔ تو پھر کیونکر جائز ہے کہ خداوند قادرِ مطلق اور ازلی اور ابدی پر یہ بہتان باندھا جائے کہ وہ ہمیشہ اپنی ذات میں کامل اور غنی اور قادرِ مطلق رہ کر آخر کار ایسے ناقص بیٹے کا محتاج ہو گیا۔ اور اپنے سارے جلال اور بزرگی کو بہ یکبارگی کھو دیا میں ہرگز باور نہیں کرتا کہ کوئی دانا اس ذات کامل کی نسبت کہ جو مستجمع جمیع صفات کاملہ ہے۔ ایسی ایسی ذلتیں جائز رکھے۔ اور ظاہر ہے کہ اگر ابن مریم کے واقعات کو فضول اور بیہودہ تعریفوں سے الگ کر لیا جائے تو انجیلوں سے اس کے

واقعی حالات کا یہی خلاصہ نکلتا ہے کہ وہ ایک عاجز اور ضعیف اور ناقص بندہ یعنی جیسے کہ بندے ہوا کرتے ہیں۔ اور حضرت موسیٰ کے ماتحت نبیوں میں سے ایک نبی تھا۔ اور اس بزرگ اور عظیم الشان رسول کا ایک تابع اور پس رَو تھا۔ اور خود اس بزرگی کو ہرگز نہیں پہنچا تھا۔ یعنی اس کی تعلیم ایک اعلیٰ تعلیم کی فرع تھی مستقل تعلیم نہ تھی اور وہ خود انجیلوں میں اقرار کرتا ہے کہ میں نہ نیک ہوں اور نہ عالم الغیب ہوں نہ قادر ہوں بلکہ ایک بندہ عاجز ہوں اور انجیل کے بیان سے ظاہر ہے کہ اس نے گرفتار ہونے سے پہلے کئی دفعہ رات کے وقت اپنے بچاؤ کے لئے دعا کی اور چاہتا تھا کہ دعا اس کی قبول ہو جائے مگر اس کی وہ دعا قبول نہ ہوئی۔ اور نیز جیسے عاجز بندے آزمائے جاتے ہیں وہ شیطان سے آزمایا گیا۔ پس اس سے ظاہر ہے کہ وہ ہر طرح عاجز ہی عاجز تھا۔ مخرج معلوم کی راہ سے جو پلیدی اور ناپاکی کا میرز ہے۔ تولد پاکر مدت تک بھوک اور پیاس اور درد اور بیماری کا دُکھ اٹھاتا رہا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ وہ بھوک کے دُکھ سے ایک انجیر کے نیچے گیا۔ مگر چونکہ انجیر پھلوں سے خالی پڑی ہوئی تھی اس لئے محروم رہا۔ اور یہ بھی نہ ہو سکا کہ دو چار انجیریں اپنے کھانے کے لئے پیدا کر لیتا۔ غرض ایک مدت تک ایسی ایسی آلودگیوں میں رہ کر اور ایسے ایسے دُکھ اٹھا کر باقرار عیسائیوں کے مر گیا۔ اور اس جہان سے اُٹھایا گیا۔

اب ہم پوچھتے ہیں کہ کیا خداوند قادرِ مطلق کی ذات میں ایسی ہی صفات ناقصہ ہونی چاہئیں کیا وہ اسی سے قدوس اور ذوالجلال کہلاتا ہے کہ وہ ایسے

عیبوں اور نقصانوں سے بھرا ہوا ہے اور کیا ممکن ہے کہ ایک ہی ماں یعنی مریم کے پیٹ میں سے پانچ بچے پیدا ہو کر ایک بچہ خدا کا بیٹا بلکہ خدا بن گیا - اور چار باقی جو رہے ان بیچاروں کو خدائی سے کچھ بھی حصّہ نہ ملا بلکہ قیاس یہ چاہتا تھا کہ جب کہ کسی مخلوق کے پیٹ سے خدا بھی پیدا ہو سکتا ہے - یہ نہیں کہ ہمیشہ آدمی سے آدمی اور گدھی سے گدھا پیدا ہو تو جہاں کہیں کسی عورت کے پیٹ سے خدا پیدا ہو تو پھر اس پیٹ سے کوئی مخلوق پیدا نہ ہو بلکہ جس قدر بچے پیدا ہوتے جائیں وہ سب خدا ہی ہوں تا وہ پاک رحم مخلوق کی شرکت سے منزہ رہے - اور فقط خداؤں ہی کے پیدا ہونے کی ایک کان ہو - پس قیاس مذکرہ بالا کے رُو سے لازم تھا کہ حضرت مسیح کے دوسرے بھائی اور بہن بھی کچھ نہ کچھ خدائی میں سے بخرہ پاتے - اور ان پانچوں حضرات کی والدہ تو رب الارباب ہی کہلاتی - کیونکہ یہ پانچوں حضرات روحانی اور جسمانی قوتوں میں اسی سے فیض یاب ہیں -

عیسائیوں نے ابن مریم کی بے جا تعریفوں میں بہت سا افترا بھی کیا - مگر پھر بھی اس کے نقصانوں کو چھپا نہ سکے - اور اس کی آلودگیوں کا آپ اقرار کر کے پھر خواہ نخواہ اس کو خدا تعالیٰ کا بیٹا قرار دیا - یوں تو عیسائی اور یہودی اپنی عجیب کتابوں کے رُو سے سب خدا کے بیٹے ہی ہیں - بلکہ ایک آیت کی رُو سے آپ ہی خدا ہیں - مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بدھ مت والے اپنے افترا اور اختراع میں ان سے اچھے رہے - کیونکہ انہوں نے بدھ کو خدا ٹھہرا کر پھر ہرگز اس کے لئے یہ تجویز نہیں کیا کہ اس نے پلیدی اور ناپاکی کی راہ سے تولد پایا تھا یا کسی قسم کی نجاست کھائی تھی بلکہ ان کا بدھ کی نسبت یہ اعتقاد ہے کہ وہ منہ کے راستے سے پیدا ہوا تھا - پر

افسوس عیسائیوں نے بہت سی جعلسازیاں تو کیں مگر یہ جعلسازی نہ سوجھی کہ مسیح کو بھی مونہہ کے راستہ سے ہی پیدا کرتے اور اپنے خدا کو پیشاب اور پلیدی سے بچاتے اور نہ یہ سوجھی کہ موت جو حقیقت الوہیت سے بالکل منافی ہے۔اس پر وارد نہ کرتے اور نہ یہ خیال آیا کہ جہاں مریم کے بیٹے نے انجیلوں میں اقرار کیا ہے کہ میں نہ نیک ہوں اور نہ دانا مطلق ہوں نہ خود بخود آیا ہوں۔نہ عالم الغیب ہوں نہ قادر ہوں نہ دعا کی قبولیت میرے ہاتھ میں ہے۔میں صرف ایک عاجز بندہ اور مسکین آدم زاد ہوں کہ جو ایک مالک رب العالمین کا بھیجا ہوا آیا ہوں۔ان سب مقاموں کو انجیل سے نکال ڈالنا چاہیے۔اب خلاصہ کلام یہ ہے کہ جو عظیم الشان صداقت الحمد للہ کے مضمون میں ہے وہ بجز پاک اور مقدس مذہب اسلام کے کسی دوسرے مذہب میں ہرگز پائی نہیں جاتی۔لیکن اگر برہمو لوگ کہیں کہ صداقت مذکورہ بالا کے ہم قائل ہیں۔تو جاننا چاہیئے کہ وہ بھی اپنے اس بیان میں جھوٹے ہیں۔کیونکہ ہم اس مضمون میں لکھ چکے ہیں کہ برہمو لوگ خدا تعالیٰ کے لئے گونگا اور غیر متکلم ہونا اور نطق پر ہرگز قادر نہ ہونا اور اپنے علوم کے القا اور الہام سے عاجز ہونا تجویز کرتے ہیں۔اور جو حقیقی اور کامل ہادی میں صفات کاملہ ہونی چاہیئے۔ان صفات سے اس کو خالی سمجھتے ہیں۔بلکہ اس قدر ایمان بھی انہیں نصیب نہیں کہ وہ خدائے تعالیٰ کی نسبت یہ اعتقاد رکھیں کہ اپنی ہستی اور الوہیت کو اس نے اپنے ارادے اور اختیار سے دنیا میں ظاہر کیا ہے۔برخلاف اس کے وہ تو یہ کہتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ ایک مُردہ یا ایک پتھر کی طرح گوشۂ گمنامی میں پڑا ہوا تھا۔عقلمندوں نے آپ تحقیق کر کے اس کے وجود کا پتہ لگایا۔اور اس کی خدائی کو دنیا میں مشہور کیا۔پس ظاہر ہے کہ

وہ بھی مثل اپنے اور بھائیوں کے محامد کاملہ حضرت احدیت سے منکر ہیں۔ بلکہ جن تعریفوں سے اس کو یاد کرنا چاہیئے۔ وہ تمام تعریفیں اپنے نفس کی طرف منسوب کرتے ہیں ٭

رب العلمین الرحمن الرحیم مالک یوم الدّین

اس جگہ سورۂ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی چار صفتیں بیان فرمائیں۔ یعنی رب العالمین۔ رحمان رحیم۔ مالک یوم الدین اور ان ہر چہار صفتوں میں سے رب العالمین کو سب سے مقدم رکھا۔ اور پھر بعد اس کے صفت رحمان کو ذکر کیا۔ پھر صفت رحیم کو بیان فرمایا۔ پھر سب کے اخیر صفت مالک یوم الدین کو لائے۔ پس سمجھنا چاہیئے کہ یہ ترتیب خدا تعالیٰ نے کیوں اختیار کی۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ ان صفات اربعہ کی ترتیب طبعی یہی ہے۔ اور اپنی واقعی صورت میں اسی ترتیب سے یہ صفتیں ظہور پذیر ہوئی ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ دنیا پر خدا کا چار طور پر فیضان پایا جاتا ہے۔ جو غور کرنے سے ہر ایک عاقل اس کو سمجھ سکتا ہے۔ پہلا فیضان فیضان اعم ہے۔ یہ وہ فیضان مطلق ہے کہ جو بلا تمیز ذی روح و غیر ذی روح افلاک سے لے کر خاک تک تمام چیزوں پر علی الاتصال جاری ہے اور ہر ایک چیز کا عدم سے صورت وجود پکڑنا اور پھر وجود کا حد کمال تک پہنچنا اسی فیضان کے ذریعہ سے ہے۔ اور کوئی چیز جان دار ہو یا غیر جاندار اس سے باہر نہیں۔ اسی سے وجود تمام ارواح و اجسام ظہور پذیر ہوا اور ہوتا ہے۔ اور اسی سے ہر ایک چیز نے پرورش پائی اور پاتی ہے۔ یہی فیضان تمام کائنات کی جان ہے اگر ایک

لمحہ منقطع ہو جائے تو تمام عالم نابود ہو جائے اور اگر یہ فیضان نہ ہوتا تو مخلوقات میں سے کچھ بھی نہ ہوتا۔ اس کا نام قرآن شریف میں ربوبیت ہے۔ اور اسی کے رُو سے خدا کا نام رب العالمین ہے جیسا کہ اس نے دُوسری جگہ بھی فرمایا ہے۔ وھو رب کل شیٔ (الجزو ۸) یعنی خدا ہر ایک چیز کا رب ہے۔ اور کوئی چیز عالم کی چیزوں میں سے اس کی ربوبیت سے باہر نہیں۔ سو خدا نے سورۃ فاتحہ میں سب صفات فیضانی میں سے پہلے صفت رب العالمین کو بیان فرمایا۔ اور کہا۔ الحمد للہ رب العالمین۔ یہ اس لئے کہا کہ سب فیضانی صفتوں میں سے تقدم طبعی صفت ربوبیت کو حاصل ہے۔ یعنی ظہور کے رو سے یہی صفت مقدم الظہور اور تمام صفاتِ فیضانی سے اعم ہے۔ کیونکہ ہر ایک چیز پر خواہ جاندار ہو۔ خواہ غیر جاندار مشتمل ہے۔ پھر دوسری قسم فیضان کی جو دوسرے مرتبے پر واقعہ ہے۔ فیضانِ عام ہے۔ اس میں اور فیضان اعم میں یہ فرق ہے کہ فیضان اعم تو ایک عام ربوبیت ہے جس کے ذریعہ سے کل کائنات کا ظہور اور وجود ہے اور یہ فیضان جس کا نام فیضان عام ہے۔ یہ ایک خاص عنایت ازلیہ ہے جو جانداروں کے حال پر مبذول ہے یعنی ذی روح چیزوں کی طرف حضرتِ باری کی جو ایک خاص توجہ ہے اس کا نام فیضان عام ہے اور اس فیضان کی یہ تعریف ہے کہ یہ بلا استحقاق اور بغیر اس کے کہ کسی کا کچھ حق ہو۔ سب ذی روحوں پر حسب حاجت ان کے جاری ہے کسی کے عمل کا پاداش نہیں اور اسی فیضان کی برکت سے ہر ایک جاندار جیتا جاگتا کھاتا پیتا اور آفات

سے محفوظ اور ضروریات سے متمتع نظر آتا ہے۔ اور ہر ایک ذی رُوح کے لئے تمام اسباب زندگی کے جو اس کے لئے یا اس کے نوع کے بقا کے لئے مطلوب ہیں میسّر نظر آتے ہیں۔ اور یہ سب آثار اُسی فیضان کے ہیں۔ کہ جو روحوں کو جسمانی تربیت کے لئے درکار ہیں۔ سب کچھ دیا گیا ہے اور ایسا ہی جن روحوں کو علاوہ جسمانی تربیت کے روحانی تربیت کی بھی ضرورت ہے۔ یعنی رُوحانی ترقی کی استعداد رکھتے ہیں۔ انہیں کے لئے قدیم سے عین ضرورتوں کے وقتوں میں کلام الٰہی نازل ہوتا رہا ہے۔ غرض اسی فیضانِ رحمانیت کے ذریعہ سے انسان اپنی کروڑہا ضروریات پر کامیاب ہے۔ سکونت کے لئے سطح زمین۔ روشنی کے لئے چاند اور سورج۔ دم لینے کیلئے ہوا۔ پینے کے لئے پانی۔ کھانے کے لئے انواع و اقسام کے رزق۔ اور علاج امراض کے لئے لاکھوں طرح کی ادویہ اور پوشاک کے لئے طرح طرح کی پوشیدنی چیزیں اور ہدایت پانے کے لئے صحفِ ربانی موجود ہیں۔ اور کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یہ تمام چیزیں میرے عملوں کی برکت سے پیدا ہو گئی ہیں۔ اور میں نے ہی کسی پہلے جنم میں کوئی نیک عمل کیا تھا۔ جس کی یاداشت میں یہ بے شمار نعمتیں خدا نے بنی آدم کو عنایت کیں۔ پس ثابت ہے کہ یہ فیضان جو ہزارہا طور پر ذی روحوں کے آرام کے لئے ظہور پذیر ہو رہا ہے۔ یہ عطیہ بلا استحقاق ہے۔ جو کسی عمل کے عوض میں نہیں فقط ربانی رحمت کا ایک جوش ہے۔ تا ہر ایک جاندار اپنے فطرتی مطلوب کو پہنچ جائے اور جو کچھ اس کی فطرت میں حاجتیں ڈالی گئیں وہ پوری ہو جائیں۔

پس اس فیضان میں عنایت ازلیہ کا کام یہ ہے کہ انسان اور جمیع حیوانات کی ضروریات کا تعہد کرے اور ان کی بایست اور نا بایست کی خبر رکھے۔ تا وہ ضائع نہ ہو جائیں۔ اور ان کی استعدادیں حیز کتمان میں نہ رہیں۔ اور اس صفت فیضانی کا خدائے تعالیٰ کی ذات میں پایا جانا قانونِ قدرت کے ملاحظہ سے نہایت بدیہی طور پر ثابت ہو رہا ہے۔ کیونکہ کسی عاقل کو اس میں کلام نہیں کہ جو کچھ چاند اور سورج اور زمین اور عناصر وغیرہ ضروریات دنیا میں پائی جاتی ہیں۔ جن پر تمام ذی روحوں کی زندگی کا مدار ہے اسی فیضان کے اثر سے ظہور پذیر ہیں اور ہر ایک متنفس بلا تمیز انسان و حیوان و مومن و کافر و نیک و بد حسب حاجت اپنے ان فیوض مذکورہ بالا سے مستفیض ہو رہا ہے۔ اور کوئی ذی روح اس سے محروم نہیں اور اس فیضان کا نام قرآن شریف میں رحمانیت ہے اور اسی کے رُو سے خدا کا نام سورۃ فاتحہ میں بعد صفت رب العالمین رحمٰن آیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے: الحمد للہ رب العالمین الرحمٰن۔ اسی صفت کی طرف قرآن شریف کے کئی ایک اور مقامات میں بھی اشارہ فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ منجملہ ان کے یہ ہے: واذا قیل لھم اسجدوا للرحمٰن قالوا وما الرحمٰن انسجد لما تامرنا وزادھم نفورا ۝ تبارک الذی جعل فی السماء بروجا وجعل فیھا سراجا وقمرا منیرا ۝ وھو الذی جعل الیل والنھار خلفۃ لمن اراد ان یذکر او اراد شکورا ۝ وعباد الرحمٰن الذین

یمشون علی الارض هونا واذا خاطبهم الجاهلون قالوا سلامًا یعنی جب کافروں اور بے دینوں اور دہریوں کو کہا جاتا ہے کہ رحمان کیا چیز ہے * (پھر بطور جواب فرمایا) رحمان وہ ذات کثیر البرکت اور خیرات دائمی ہے جس نے آسمان میں بُرج بنائے۔ بُرجوں میں آفتاب اور چاند کو رکھا۔ جو کہ عامہ مخلوقات کو بغیر تفریق کافر و مومن کے روشنی پہنچاتے ہیں۔ اسی رحمان نے تمہارے لئے یعنی تمام بنی آدم کے لئے دن اور رات بنائی جو کہ ایک دوسرے کے بعد دَورہ کرتے رہتے ہیں۔ تا جو شخص طالب معرفت ہو وہ ؐ جو شخص شکر نعمت کرنے پر مستعد ہو۔ وہ شکر کرے۔ رحمان کے حقیقی پرستار وہ لوگ ہیں کہ جو زمین پر بُردباری سے چلتے ہیں۔ اور جب جاہل لوگ ان سے سخت کلامی سے پیش آئیں تو سلامتی اور رحمت کے لفظوں سے ان کا معاوضہ کرتے ہیں۔ یعنی بجائے سختی کے نرمی اور بجائے گالی کے دُعا دیتے ہیں۔ اور تشبہ باخلاق رحمانی کرتے ہیں۔ کیونکہ رحمان بھی بغیر تفریق نیک و بد کے اپنے سب بندوں کو سورج اور چاند اور زمین اور دوسری بیشمار نعمتوں سے فائدہ پہنچاتا ہے۔

پس ان آیات میں خدائے تعالےٰ نے اچھی طرح کھول دیا کہ رحمان کا لفظ ان معنوں کر کے خدا پر بولا جاتا ہے کہ اس کی رحمت وسیع عام طور پر ہر ایک بُرے بھلے پر محیط ہو رہی ہے جیسا ایک جگہ اور بھی اسی رحمت عام کی طرف اشارہ فرمایا ہے عذابی اصیب

* تو وہ رحمان کے نام سے متنفر ہو کر بطور انکار سوال کرتے ہیں ۔ ؐ ہم ان دقائق معرفت سے فائدہ اٹھاوے اور جہل اور غفلت سے کسی طرح ... اور

بہ من اشاء و رحمتی وسعت کل شئی یعنی میں اپنا عذاب جس کو لائق اس کے دیکھتا ہوں پہنچاتا ہوں اور میری رحمت نے ہر ایک چیز کو گھیر رکھا ہے۔ اور پھر ایک اور موقعہ پر فرمایا: قل من یکلؤکم باللیل والنھار من الرحمن یعنی ان کافروں اور نافرمانوں کو کہہ کہ اگر خدا میں صفت رحمانیت کی نہ ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ تم اس کے عذاب سے محفوظ رہ سکتے یعنی اس کی رحمانیت کا اثر ہے کہ وہ کافروں اور بے ایمانوں کو مہلت دیتا ہے۔ اور جلد تر نہیں پکڑتا پھر ایک اور جگہ اسی رحمانیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اولم یروا الی الطیر فوقھم صافات ویقبضن ما یمسکھن الا الرحمن الجزو ۲۹ یعنی کیا ان لوگوں نے اپنے سروں پر پرندوں کو اڑتے ہوئے نہیں دیکھا کہ کبھی وہ بازو کھلے ہوئے ہوتے ہیں اور کبھی سمیٹ لیتے ہیں۔ رحمٰن ہی ہے کہ ان کو گرنے سے تھام رکھتا ہے یعنی فیضانِ رحمت الہی تمام ذی روحوں پر محیط ہو رہا ہے کہ پرندے بھی جو ایک پیسے کے دو تین مل سکتے ہیں۔ وہ بھی اس فیضان کے وسیع دریا میں خوشی اور سرور سے تیر رہے ہیں۔

اور چونکہ ربوبیت کے بعد اسی فیضان کا مرتبہ ہے۔ اس جہت سے اللہ تعالیٰ نے سورۃ فاتحہ میں رب العٰلمین کی صفت بیان فرما کر پھر اس کے رحمان ہونے کی صفت بیان فرمائی۔ تا ترتیب طبعی ان کی ملحوظ رہے۔ تیسری قسم فیضان کی فیضان خاص ہے۔ اس میں اور فیضان عام میں یہ فرق ہے کہ فیضان عام میں مستفیض پر لازم نہیں کہ حصول فیض کے

اپنی حالت کو نیک بنا دے اور اپنے نفس کو حجب ظلمانیہ سے باہر نکالے۔ یا کسی قسم کا مجاہدہ اور کوشش کرے بلکہ اس فیضان میں جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں خدائے تعالیٰ آپ ہی ہر ایک ذی روح کو اس کی ضروریات جن کا وہ حسب فطرت محتاج ہے عنایت فرماتا ہے' اور بن مانگے اور بغیر کوشش کے مہیا کر دیتا ہے۔ لیکن فیضان خاص میں جہد اور کوشش اور تزکیہ قلب اور دعا اور تضرع اور توجہ الی اللہ اور دوسرا ہر طرح کا مجاہدہ جیسا کہ موقع ہو شرط ہے۔ اور اس فیضان کو وہی پاتا ہے جو ڈھونڈتا ہے اور اسی پر وارد ہوتا ہے جو اس کے لئے محنت کرتا ہے۔ اور اس فیضان کا وجود بھی ملاحظہ قانونِ قدرت سے ثابت ہے کیونکہ یہ بات نہایت بدیہی ہے کہ خدا کی راہ میں سعی کرنے والے اور غافل رہنے والے دونوں برابر نہیں ہو سکتے بلاشبہ جو لوگ دل کی سچائی سے خدا کی راہ میں کوشش کرتے ہیں۔ اور ہر ایک تاریکی اور فساد سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں ایک خاص رحمت ان کے شامل حال ہو جاتی ہے۔ اس فیضان کے رُو سے خدا تعالیٰ کا نام قرآن شریف میں رحیم ہے۔ اور یہ مرتبہ صفتِ رحیمیت کا بوجہ خاص ہونے اور مشروط بہ شرائط ہونے کے مرتبہ صفت رحمانیت سے موخر ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کی طرف سے اوّل صفت رحمانیت ظہور میں آئی ہے۔ پھر بعد اس کے صفت رحیمیت ظہور پذیر ہوئی پس اسی ترتیب طبعی کے لحاظ سے سورۃ فاتحہ میں صفت رحیمیت کو صفت رحمانیت کے بعد میں ذکر فرمایا۔ اور کہا الرحمٰن الرحیم اور صفت رحیمیت کے بیان میں کئی مقامات قرآن شریف میں اس کا ذکر موجود ہے جیسا ایک جگہ فرمایا

ہے۔ وکان بالمؤمنین رحیما یعنی خدا کی رحیمیت صرف ایمانداروں سے خاص ہے جس سے کافر کو یعنی بے ایمان اور سرکش کو حصّہ نہیں۔

اس جگہ دیکھنا چاہیئے کہ خدا نے کیسے صفت رحیمیت کو مومن کے ساتھ خاص کر دیا۔ لیکن رحمانیت کو کسی جگہ مومنین کے ساتھ خاص نہیں کیا اور کسی جگہ یہ نہیں فرمایا کہ کان بالمؤمنین رحمانًا بلکہ جو مومنین سے رحمت خاص متعلق ہے ہر جگہ اس کو رحیمیت کی صفت سے ذکر کیا ہے پھر دوسری جگہ فرمایا ہے ان رحمۃ اللہ قریب من المحسنین یعنی رحیمیت الٰہی انہیں لوگوں سے قریب ہے جو نیکوکار ہیں پھر ایک اور جگہ فرمایا ہے ان الذین آمنوا والذین ھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ اولئک یرجون رحمت اللہ واللہ غفور رحیم۔ یعنی جو لوگ ایمان لائے اور خدا کے لئے وطنوں سے یا نفس پرستیوں سے جدائی اختیار کی اور خدا کی راہ میں کوشش کی وہ خدا کی رحیمیت کے امیدوار ہیں اور خدا غفور اور رحیم ہے۔ یعنی اس کا فیضان رحیمیت ضرور ان لوگوں کے شامل حال ہو جاتا ہے کہ جو اس کے مستحق ہیں۔ کوئی ایسا نہیں جس نے اس کو طلب کیا اور نہ پایا ؎

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد
اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

چوتھا قسم فیضان کا فیضان اخص ہے یہ وہ فیضان ہے کہ جو صرف محنت اور سعی پر مترتب نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے ظہور اور بروز کے لئے اول شرط یہ ہے کہ یہ عالم اسباب جو ایک تنگ و تاریک جگہ ہے بالکل معدوم اور منہدم ہو جائے

اور قدرتِ کاملہ حضرت احدیت کے بغیر آمیزش اسباب معتادہ کے برہنہ طور پر اپنا کامل چمکارا دکھلاوے کیونکہ اس آخری فیضان میں کہ جو تمام فیوض کا خاتمہ ہے جو کچھ پہلے فیضانوں کی نسبت عندالعقل زیادتی اور کمالیت متصور ہو سکتی ہے۔ وہ یہی ہے کہ یہ فیضان نہایت منکشف اور صاف طور پر ہو۔ اور کوئی اشتباہ اور خفا اور نقص باقی نہ رہے۔ یعنی نہ مفیض کے بالارادہ فیضان میں کوئی شبہ رہ جائے اور نہ فیضان کے حقیقی فیضان اور رحمت خالصہ اور کاملہ ہونے میں کچھ جائے کلام ہو بلکہ جس مالک قدیم کی طرف سے فیض ہوا ہے۔ اس کی فیاضی اور جزادہی روز روشن کی طرح کھل جائے اور شخص فیضیاب کو بطور حق الیقین یہ امر مشہود اور محسوس ہو کہ حقیقت میں وہ مالک الملک ہی اپنے ارادے اور توجہ اور قدرت خاص سے ایک نعمت عظمیٰ اور لذت کبریٰ اس کو عطا کر رہا ہے۔ اور حقیقت میں اس کو اپنے اعمال صالحہ کی ایک کامل اور دائمی جزا کہ جو نہایت اصفیٰ اور نہایت اعلیٰ اور نہایت مرغوب اور نہایت محبوب ہے۔ مل رہی ہے کسی قسم کا امتحان اور ابتلا نہیں ہے۔ اور ایسے فیضان اکمل اور اتم اور انقیٰ اور اعلیٰ اور اجلیٰ سے متمتع ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ بندہ اس عالم ناقص اور مکدر اور کثیف اور تنگ اور منقبض اور ناپائدار اور متغیر الحال سے دوسرے عالم کی طرف انتقال کرے۔ کیونکہ یہ فیضان تجلیات عظمیٰ کا مظہر ہے۔ جن میں شرط ہے کہ محسن حقیقی کا جمال بطور عریاں اور بمرتبہ حق الیقین مشہود ہو اور کوئی مرتبہ شہود اور ظہور اور یقین کا باقی نہ رہ جائے۔ اور کوئی پردہ اسباب معتادہ کا درمیان نہ ہو۔ اور ہر ایک دقیقہ معرفت تامہ

کا ممکن قوت سے حیّز فعل میں آجائے اور نیز فیضان بھی ایسا منکشف ، اور معلوم الحقیقت ہو کہ اس کی نسبت آپ خدا نے یہ ظاہر کر دیا ہو کہ وہ ہر ایک امتحان اور ابتلا کی کدورت سے پاک ہے اور نیز اس فیضان میں وہ اعلیٰ اور اکمل درجے کی لذتیں ہوں جن کی پاک اور کامل کیفیت انسان کے دل اور روح اور ظاہر اور باطن اور جسم اور جان اور ہر ایک روحانی اور بدنی قوت پر ایسا اکمل اور ابقی احاطہ کرتی ہو کہ جس پر عقلاً اور خیالاً اور وہماً زیادت متصور نہ ہو اور یہ عالم جو ناقص الحقیقت اور مکدر الصورت اور ہالکتہ الذات اور مشتبہ الکیفیت اور ضیق الظرف ہے ان تجلیات عظمیٰ اور انوارِ اصفیٰ اور عطیات دائمی کی برداشت نہیں کر سکتا اور اشعۂ تامہ کاملہ دائمہ اس میں سما نہیں سکتے بلکہ اس کے ظہور کے لئے ایک دوسرا عالم درکار ہے کہ جو اسباب متضادہ کی ظلمت سے بکلی پاک اور منزہ اور ذاتِ واحد قہار کی اقتدارِ کامل اور خالص کا مظہر ہے ۔ ہاں اس فیضان اخص سے ان کامل انسانوں کو اس زندگی میں کچھ حظ پہنچتا ہے کہ جو سچائی کی راہ پر کامل طور پر قدم مارتے ہیں ۔ اور اپنے نفس کے ارادوں اور خواہشوں سے الگ ہو کر بکلی خدا کی طرف جھک جاتے ہیں کیونکہ وہ مرنے سے پہلے مرتے ہیں ۔ اور اگرچہ بظاہر صورت اس عالم میں ہیں ۔ لیکن درحقیقت وہ دوسرے عالم میں سکونت رکھتے ہیں ۔ پس چونکہ وہ اپنے دل کو اس دنیا کے اسباب سے منقطع کر لیتے ہیں ۔ اور عادات بشریت کو توڑ کر اور بہ یکبارگی غیر اللہ سے منہ پھیر کر وہ طریق جو خارق عادت ہے اختیار

کر لیتے ہیں اس لئے خداوند کریم بھی اُن کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کرتا ہے۔ اور بطور خارقِ عادت کے ان پر اپنے وہ انوارِ خاصہ ظاہر کرتا ہے۔ کہ جو دوسروں پر بجز موت کے ظاہر نہیں ہو سکتے۔ غرض بباعث امور متذکرہ بالا وہ اس عالم میں بھی فیضانِ اخص کے نور سے کچھ حصّہ پا لیتے ہیں اور یہ فیضان ہر ایک فیض سے خاص تر اور خاتمہ تمام فیضانوں کا ہے اور اس کو پانے والا سعادتِ عظمیٰ کو پہنچ جاتا ہے۔ اور خوشحالی دائمی کو پا لیتا ہے۔ کہ جو تمام خوشیوں کا سر چشمہ ہے۔ اور جو شخص اس سے محروم رہا وہ ہمیشہ کے دوزخ میں پڑا۔ اسی فیضان کے رُو سے خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں اپنا نام مالکِ یوم الدین بیان فرمایا ہے۔ دین کے لفظ پر الف لام لانے سے یہ غرض ہے کہ یہ معنے ظاہر ہوں کہ جزا سے مراد وہ کامل جزا ہے جس کی تفصیل قرآنِ مجید میں مندرج ہے۔ اور وہ کامل جزا بجز تجلی مالکیت تامہ کے کہ جو ہادم بنیان اسباب کو مستلزم ہے ظہور میں نہیں آ سکتی۔ چنانچہ اسی کی طرف دوسری جگہ بھی اشارہ فرما کر کہا ہے کہ لمن الملک الیوم لِلّٰہ الواحد القہار یعنی اس دن ربوبیت الٰہیہ بغیر توسطِ اسباب عادیہ کے اپنی تجلی آپ دکھائے گی اور یہی مشہود اور محسوس ہو گا۔ کہ بجز قوتِ عظمیٰ اور قدرت کاملہ حضرت باری تعالیٰ کے اور سب ہیچ ہیں۔ تب سارا آرام و سرور اور سب جزا و پاداش بنظر صاف و صریح خدا ہی کی طرف سے دکھلائی دے گا۔ اور کوئی پردہ اور حجاب درمیان میں نہیں رہے گا۔ اور کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں رہے گی۔

تب جنہوں نے اس کے لئے اپنے تئیں منقطع کر لیا تھا وہ اپنے تئیں ایک کامل سعادت میں دیکھیں گے کہ جو اُن کے جسم اور جان اور ظاہر و باطن پر محیط ہو جائے گی اور کوئی حِصّہ وجود ان کے کا ایسا نہیں ہوگا کہ جو اس سعادتِ عظمیٰ کے پانے سے بے نصیب رہا ہو۔ اور اس جگہ مالک یوم الدّین کے لفظ میں یہ بھی اشارہ ہے کہ اس روز راحت یا عذاب اور لذت یا درد جو کچھ بنی آدم کو پہنچے گا اس کا اصل موجب خدائے تعالیٰ کی ذات ہوگی اور مالک امر مجازات کا حقیقی طور پر وہی ہوگا۔ یعنی اسی کا وصل یا فصل سعادت ابدی یا شقاوتِ ابدی کا موجب ٹھہریگا۔ اس طرح پر کہ جو لوگ اس کی ذات پر ایمان لائے تھے اور توحید اختیار کی تھی اور اس کی خالص محبت سے اپنے دلوں کو رنگین کر لیا تھا۔ ان پر انوارِ رحمت اس ذات کامل کے صاف اور آشکارا طور پر نازل ہونگے اور جن کو ایمان اور محبتِ الٰہیہ حاصل نہیں ہوئی وہ اس لذت اور راحت سے محروم رہینگے۔ اور عذاب الیم میں مبتلا ہو جائیں گے۔ یہ فیوض اربعہ ہیں جن کو ہم نے تفصیل وار لکھ دیا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ صفتِ رحمان کو صفتِ رحیم پر مقدم رکھنا نہایت ضروری اور مقتضائے بلاغتِ کاملہ ہے۔ کیونکہ صحیفۂ قدرت پر جب نظر ڈالی جائے تو پہلے پہل خدا تعالیٰ کی عام ربوبیت پر نظر پڑتی ہے۔ پھر اس کی رحمانیت پر پھر اس کی رحیمیت پر پھر اس کے مالک یوم الدین ہونے پر اور کمال بلاغت اسی کا نام ہے کہ جو صحیفۂ فطرت میں ترتیب ہو

وہی ترتیب صحیفۂ الہام میں بھی ملحوظ رہے۔ کیونکہ کلام میں ترتیب قدرتی کو منقلب کرنا گویا قانون قدرت کو منقلب کرنا ہے۔ اور نظام طبعی کو اُلٹا دینا ہے۔ کلام بلیغ کے لئے یہ نہایت ضروری ہے۔ کہ نظام کلام نظام طبعی کے ایسا مطابق ہو کہ گویا اس کی عکسی تصویر ہو اور جو امر طبعاً اور وقوعاً مقدم ہو اس کو وضعاً بھی مقدم رکھا جائے۔ سو آیت موصوفہ میں یہ اعلیٰ درجہ کی بلاغت ہے کہ باوجود کمال فصاحت اور خوش بیانی کے واقعی ترتیب کا نقشہ کھینچ کر دکھلا دیا ہے۔ اور وہی طرز بیان اختیار کی ہے جو کہ ہر ایک صاحب نظر کو نظام عالم میں بدیہی طور پر نظر آرہی ہے۔ کیا یہ نہایت سیدھا راستہ نہیں ہے کہ جس ترتیب سے نعماء الٰہی صحیفہ فطرت میں واقع ہیں۔ اسی ترتیب سے صحیفۂ الہام میں بھی واقعہ ہوں سو ایسی عمدہ اور پُر حکمت ترتیب پر اعتراض کرنا حقیقت میں انہیں اندھوں کا کام ہے جن کی بصیرت اور بصارت دونوں یکبارگی جاتی رہی ہیں ؎

چشم بد اندیش کہ بر کندہ باد
عیب نماید ہنرش در نظر

اب ہم پھر تقریر کو دوہرا کر اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ جو کچھ خدائے تعالیٰ نے سورہ ممدوحہ میں رب العالمین کی صفت سے لے کر مالک یوم الدین تک بیان فرمایا ہے یہ حسب تصریحات قرآن شریف چار عالیشان صداقتیں ہیں۔ جن کا اس جگہ کھول کر بیان کرنا قرین مصلحت ہے۔ پہلی صداقت یہ کہ خدائے تعالیٰ رب العالمین ہے یعنی عالم کے اشیاء

میں سے جو کچھ موجود ہے۔ سب کا رب اور مالک خدا ہے۔ اور جو کچھ عالم میں نمودار ہو چکا ہے۔ اور دیکھا جاتا ہے یا ٹٹولا جاتا ہے۔ یا عقل اس پر محیط ہو جاتی ہے۔ وہ سب چیزیں مخلوق ہی ہیں۔ اور ہستی حقیقی بجز ایک ذات حضرتِ باری تعالیٰ کے اور کسی چیز کے لئے حاصل نہیں غرض عالم بجمیع اجزا مخلوق اور خدا کی پیدائش ہے۔ اور کوئی چیز اجزائے عالم میں سے ایسی نہیں کہ جو خدا کی پیدائش نہ ہو اور خدائے تعالیٰ اپنی ربوبیت تامہ کے ساتھ عالم کے ذرہ ذرہ پر متصرف اور حکمران ہے۔ اور اس کی ربوبیت ہر وقت کام میں لگی ہوئی ہے۔ یہ نہیں کہ خدائے تعالیٰ دنیا کو بنا کر اس کے انتظام سے الگ ہو بیٹھا ہے اور اُسے نیچر کے قاعدے کے ایسا سپرد کیا ہے۔ کہ خود کسی کام میں دخل بھی نہیں دیتا۔ اور جیسے کوئی کل بعد بنائے جانے کے پھر بنانے والے سے بے علاقہ ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی مصنوعاتِ صانع حقیقی سے بے علاقہ ہیں۔ بلکہ وہ رب العالمین اپنی ربوبیت تامہ کی آب پاشی ہر وقت برابر تمام عالم پر کر رہا ہے۔ اور اس کی ربوبیت کا مینہ بالاتصال تمام عالم پر نازل ہو رہا ہے۔ اور کوئی ایسا وقت نہیں کہ اس کے رشح فیض سے خالی ہو۔ بلکہ عالم کے بنانے کے بعد بھی اس مبدء فیوض کی فی الحقیقت بلا ایک ذرا تفاوت کے ایسی ہی حاجت ہے کہ گویا ابھی تک اس نے کچھ بھی نہیں بنایا اور جیسا دنیا اپنے وجود اور نمود کے لئے اس کی ربوبیت کی محتاج تھی ایسا ہی اپنے بقا اور قیام کے لئے اس کی ربوبیت کی حاجتمند ہے وہی ہے

جو ہر دم دنیا کو سنبھالے ہوئی ہے۔ اور دنیا کا ہر ذرّہ اسی سے تر و تازہ ہے۔ اور وہ اپنی مرضی اور ارادے کے موافق ہر چیز کی ربوبیت کر رہا ہے یہ نہیں کہ بلا ارادہ کسی شئے کے ربوبیت کا موجب ہو۔

غرض آیات قرآنی کی رُو سے جن کا خلاصہ ہم بیان کر رہے ہیں۔ اس صداقت کا یہ منشا ہے کہ ہر ایک چیز کہ جو عالم میں پائی جاتی ہے وہ مخلوق ہے اور اپنے تمام کمالات اور اپنے تمام حالات اور اپنے تمام اوقات میں خدائے تعالیٰ کی ربوبیت کی محتاج ہے اور کوئی روحانی یا جسمانی ایسا کمال نہیں ہے جس کو کوئی مخلوق خود بخود اور بغیر ارادہ خاص اس متصرف مطلق کے حاصل کر سکتا ہو۔ اور نیز حسب توضیح اسی کلام پاک کے اس صداقت اور ایسا ہی دوسری صداقتوں میں یہ معنی بھی ملحوظ ہیں کہ رب العالمین وغیرہ صفتیں جو خدائے تعالیٰ میں پائی جاتی ہیں یہ اسی کی ذات واحد لاشریک سے خاص ہیں۔ اور کوئی دوسرا اُن میں شریک نہیں جیسا کہ اس سورۃ کے پہلے فقرہ میں یعنی الحمد للہ میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ تمام محامد خدا ہی سے خاص ہیں۔

دوسری صداقت رحمان ہے کہ جو بعد رب العالمین بیان فرمایا گیا اور رحمان کے معنی جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں یہ ہیں کہ جس قدر جاندار ہیں خواہ وہ ذی شعور اور خواہ غیر ذی شعور اور خواہ نیک اور خواہ بد ان سب کے قیام اور بقاء وجود اور بقائے نوع کے لئے اور ان کی تکمیل کے لئے خدائے تعالیٰ اپنی رحمتِ عامہ کے رُو سے ہر ایک قسم کے اسباب

مطلوبہ میسّر کر دیئے ہیں۔ اور ہمیشہ میسّر کرتا رہتا ہے۔ اور یہ عطیہ محض ہے۔ کہ جو کسی عامل کے عمل پر موقوف نہیں۔

تیسری صداقت رحیم ہے کہ جو بعد رحمٰن کے مذکور ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ خدائے تعالیٰ سعی کرنے والوں کی سعی پر بمقتضائے رحمتِ خاصہ ثمراتِ حسنہ مترتب کرتا ہے۔ توبہ کرنے والوں کے گناہ بخشتا ہے۔ مانگنے والوں کو دیتا ہے۔ کھٹکھٹانے والوں کے لئے کھولتا ہے۔

چوتھی صداقت جو سورۃ فاتحہ میں مندرج ہے۔ مالک یوم الدین ہے یعنی کمال و کامل جزا سزا کہ جو ہر ایک قسم کے امتحان و ابتلا اور توسطِ اسباب غفلت و اشتبا سے منزّہ ہے۔ اور ہر ایک کدورت و کثافت اور شک اور شبہ اور نقصان سے پاک ہے۔ اور تجلیاتِ عظمیٰ کا مظہر ہے۔ اس کا مالک بھی وہی اللہ قادر مطلق ہے۔ اور وہ اس بات سے ہرگز عاجز نہیں۔ کہ اپنی کامل جزا کو جو دن کی طرح روشن ہے۔ ظہور میں لا دے۔ اور اس صداقت عظمیٰ کے ظاہر کرنے سے حضرت احدیت کا یہ مطلب ہے کہ تا ہر ایک نفس پر بطور حق الیقین امور مفصلہ ذیل کھل جائیں۔

اول یہ امر کہ جزا سزا ایک واقعی اور یقینی امر ہے کہ جو مالک حقیقی کی طرف سے اور اسی کے ارادہ خاص سے بندوں پر وارد ہوتا ہے۔ اور ایسا کھل جانا دنیا میں ممکن نہیں کیونکہ اس عالم میں یہ بات عام لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتی کہ جو کچھ خیر و شر و راحت و رنج پہنچ رہا ہے وہ کیوں پہنچ رہا ہے۔ اور کس کے حکم و اختیار سے پہنچ رہا ہے۔ اور کسی کو ان میں سے یہ آواز نہیں آتی

کہ وہ اپنی جزا پا رہا ہے۔ اور کسی پر بطور مشہود و محسوس منکشف نہیں ہوتا کہ جو کچھ وہ بھگت رہا ہے حقیقت میں وہ اس کے عملوں کا بدلہ ہے۔

دوسرے اس صداقت میں اس امر کا کھلنا مطلوب ہے کہ اسباب عادیہ کچھ چیز نہیں ہیں اور فاعلِ حقیقی خدا ہے۔ اور وہی ایک ذاتِ عظمیٰ ہے کہ جو جمیع فیوض کا مبدء اور ہر ایک جزا سزا کا مالک ہے۔

تیسرے اس صداقت میں اس بات کا ظاہر کرنا مطلوب ہے۔ کہ سعادتِ عظمیٰ اور شقاوتِ عظمیٰ کیا چیز ہے۔ یعنی سعادتِ عظمیٰ وہ فوزِ عظیم کی حالت ہے کہ جب نور اور سرور اور لذت اور راحت انسان کے تمام ظاہر و باطن اور تن اور جان پر محیط ہو جائے۔ اور کوئی عضو اور قوت اس سے باہر نہ رہے۔ اور شقاوتِ عظمیٰ وہ عذاب الیم ہے کہ جو بباعث نافرمانی اور ناپاکی اور بعد اور دُوری کے دلوں سے مشتعل ہو کر بدنوں پر مستولی ہو جائے اور تمام وجود فی النار و السقر معلوم ہو اور یہ تجلیاتِ عظمیٰ اس عالم میں ظاہر نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ اس تنگ اور منقبض اور مکدر عالم کو جو روپوش اسباب ہو کر ایک ناقص حالت میں پڑا ہے۔ ان کے ظہور کی برداشت نہیں بلکہ اس عالم پر ابتلا اور آزمائش غالب ہے۔ اس کی راحت اور رنج دونوں ناپائدار اور ناقص ہیں۔ اور نیز اس عالم میں جو کچھ انسان پر وارد ہوتا ہے وہ زیر پردہ اسباب ہے جس سے مالک الجزا کا چہرہ محجوب اور مکتوم ہو رہا ہے۔ اس لئے یہ خالص اور کامل اور منکشف طور پر یوم الدین یعنی یوم الجزاء وہ عالم ہوگا جو اس عالم کے ختم ہونے کے بعد آوے گا۔

اور وہی عالم تجلّیات عظمیٰ کا مظہر اور جلال اور جمال کے پورے ظہور کی جگہ ہے۔
اور چونکہ یہ عالم دنیوی اپنی اصل وضع کے رُو سے دار الجزا نہیں بلکہ دارالابتلا ہے
اس لئے جو کچھ عسُر و یُسر راحت و تکلیف اور غم اور خوشی اس عالم میں لوگوں
پر وارد ہوتی ہے۔ اس کو خدائے تعالیٰ کے لطف یا قہر پر دلالت قطعی نہیں۔
مثلاً کسی کا دولت مند ہو جانا اس بات پر دلالت قطعی نہیں کرتا۔ کہ
خدائے تعالیٰ اس پر خوش ہے۔ اور نہ کسی کا مفلس اور نادار ہونا اس
بات پر دلالت کرتا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ اس پر ناراض ہے بلکہ یہ دونوں طور
کے ابتلا ہیں۔ تا دولتمند کو اس کی دولت میں اور مفلس کو اس کی مفلسی
میں جانچا جائے۔ یہ چار صداقتیں ہیں جن کا قرآن شریف میں مفصل بیان
موجود ہے۔ اور قرآن شریف کے پڑھنے سے معلوم ہو گا کہ ان صداقتوں
کی تفصیل میں آیاتِ قرآنی ایک دریا کی طرح بہتی ہوئی چلی جاتی ہیں اور اگر
ہم اس جگہ مفصل طور پر ان تمام آیات کو لکھتے تو بہت سے اجزا کتاب کے
اس میں خرچ ہو جاتے۔ سو ہم نے اس نظر سے کہ انشاء اللہ عنقریب براہین
قرآنی کے موقعہ پر وہ تمام آیات بہ تفصیل لکھے جائیں گے۔ ان تمہیدی مباحث
میں صرف سورۃ فاتحہ کے قلّ و دلّ کلمات پر کفایت کی۔

اب بعد اس کے ہم بیان کرنا چاہتے ہیں کہ یہ چاروں صداقتیں
جو بیّن الثبوت اور بدیہی الصدق ہیں۔ ایسے بے نظیر اور اعلیٰ درجہ کی ہیں۔
کہ یہ بات دلائل قطعیہ سے ثابت ہے کہ حضرت خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ
وسلّم کے ظہور فرمانے کے وقت یہ چاروں صداقتیں دُنیا سے گم ہو چکی

تھیں اور کوئی قوم پردہ زمین پر ایسی موجود نہیں تھی کہ جو بغیر آمیزش افراط یا تفریط کے ان صداقتوں کی پابند ہو۔ پھر جب قرآن شریف نازل ہوا تو اس کلام مقدس نے نئے سرے ان گم شدہ صداقتوں کو زاویہ گمنامی سے باہر نکالا۔ اور گمراہوں کو ان کے حقانی وجود سے اطلاع دی اور دنیا میں ان کو پھیلایا۔ اور ایک عالم کو ان کے نور سے منور کیا۔ لیکن اس بات کے ثبوت کے لئے کہ کیونکر تمام قومیں ان صداقتوں سے بے خبر اور ناواقف محض تھیں۔ یہی ایک کافی دلیل ہے۔ کہ اب بھی دنیا میں کوئی قوم بجز دین حق اسلام کے ٹھیک ٹھاک اور کامل طور پر ان صداقتوں پر قائم نہیں۔ اور جو شخص کسی ایسی قوم کے وجود کا دعویٰ کرے تو بار ثبوت اسی کے ذمہ ہے۔ ماسوا اس کے قرآنی شہادت کہ جو ہر ایک دوست و دشمن میں شائع ہونے کی وجہ سے ہر ایک مخاصم پر حجت ہے۔ اس بات کے لئے ثبوت کافی ہے۔ اور وہ شہادتیں جابجا قرآن مجید میں بکثرت موجود ہیں اور خود کسی تاریخ دان اور واقف حقیقت کو اس سے بے خبری نہیں ہوگی کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے وقت تک ہر ایک قوم کی ضلالت اور گمراہی کمال کے درجہ تک پہنچ چکی تھی۔ اور کسی صداقت پر کامل طور پر ان کا قیام نہیں رہا تھا۔ چنانچہ اگر اوّل یہودیوں ہی کے حال پر نظر کریں تو ظاہر ہوگا۔ کہ ان کو خدائے تعالیٰ کی ربوبیت تامہ میں بہت سے شک و شبہات پیدا ہوگئے تھے اور انہوں نے ایک ذات رب العالمین پر کفایت نہ کرکے صدہا ارباب متفرقہ اپنے لئے بنا رکھے تھے یعنی مخلوق پرستی اور دیوتا پرستی

کالبخابیت درجہ اُن میں بازار گرم تھا جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے ان کا یہ حال قرآن شریف میں بیان کر کے فرمایا ہے۔ اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابًا من دُون اللہ یعنی یہودیوں نے اپنے مولویوں اور درویشوں کو کہ جو مخلوق اور غیر خدا ہیں اپنے رب اور قاضی الحاجات ٹھہرا رکھے ہیں۔ اور نیز اکثروں کا یہودیوں میں سے بعض نیچریوں کی طرح یہ اعتقاد ہو گیا تھا کہ انتظام دُنیا کا قوانین منضبط متعینہ پر چل رہا ہے۔ اور اس قانون میں مختارانہ تصرف کرنے سے خدا تعالیٰ قاصر اور عاجز ہے۔ گویا اس کے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے ہیں نہ اس قاعدے کے برخلاف کچھ ایجاد کر سکتا ہے۔ اور نہ فنا کر سکتا ہے۔ بلکہ جب سے کہ اس نے اس عالم کا ایک خاص طور پر شیرازہ باندھ کر اس کی پیدائش سے فراغت پالی ہے۔ تب سے یہ کل اپنے ہی پُرزوں کی صلاحیت کی وجہ سے خود بخود چل رہی ہے۔ اور رب العالمین کسی قسم کا تصرّف اور دخل اس کل کے چلنے میں نہیں رکھتا اور نہ اس کو اختیار رہے کہ اپنی مرضی کے موافق اور اپنی خوشنودی یا ناخوشنودی کے رُو سے اپنی ربوبیت کو بہ تفاوت مراتب ظاہر کرے یا اپنے ارادہ خاص سے کسی طور کا تغیّر اور تبدیل کرے۔ بلکہ یہودی لوگ خدائے تعالیٰ کو جسمانی اور مجسم قرار دے کر عالم جسمانی کی طرح اور اُس کا ایک جُز سمجھتے ہیں۔ اور ان کی نظر ناقص میں یہ سمایا ہوا ہے کہ بہت سی باتیں کہ جو مخلوق پر جائز ہیں وہ خدا پر بھی جائز ہیں اور اس کو من کل الوجوہ منزہ خیال نہیں کرتے اور ان کی توریت میں جو محرف اور مبدل

ہے۔خدائے تعالیٰ کی نسبت کئی طور کی بے ادبیاں پائی جاتی ہیں۔چنانچہ پیدائش کے ۳۲ باب میں لکھا ہے کہ

"خدائے تعالیٰ یعقوب سے تمام رات صبح تک کشتی لڑتا رہا۔ اور اس پر غالب نہ ہوا۔"

اسی طرح برخلاف اس اصول کے کہ خدائے تعالیٰ ہر ایک مافی العالم کا رب ہے بعض مردوں کو انہوں نے خدا کے بیٹے قرار دے رکھا ہے اور کسی جگہ عورتوں کو خدا کی بیٹیاں لکھا گیا ہے۔ اور کسی جگہ بائیبل میں یہ بھی فرما دیا ہے کہ تم سب خدا ہی ہو۔اور سچ تو یہ ہے کہ عیسائیوں نے بھی انہیں تعلیموں سے مخلوق پرستی کا سبق سیکھا ہے۔کیونکہ جب عیسائیوں نے معلوم کیا کہ بائیبل کی تعلیم بہت سے لوگوں کو خدا کے بیٹے اور خدا کی بیٹیاں بلکہ خدا ہی بناتی ہے تو انہوں نے کہا کہ آؤ ہم بھی اپنے ابنِ مریم کو انہیں میں داخل کریں۔تا وہ دوسرے بیٹوں سے کم نہ رہ جائے۔اسی جہت سے خدائے تعالیٰ نے قرآن شریف میں فرمایا ہے کہ عیسائیوں نے ابنِ مریم کو ابن اللہ بنا کر کوئی نئی بات نہیں نکالی۔بلکہ پہلے بے ایمانوں اور مشرکوں کے قدم پر قدم مارا ہے۔غرض حضرت خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہودیوں کی یہ حالت تھی کہ مخلوق پرستی بدرجۂ غایت اُن پر غالب آگئی تھی۔اور عقائد حقہ سے بہت دُور جا پڑی تھی۔یہاں تک کہ بعض اُن کے ہندوؤں کی طرح تناسخ کے بھی قائل تھے۔اور بعض جزا سزا کے قطعاً منکر تھے۔اور بعض مجازات کو صرف دُنیا میں محصور سمجھتے

تھے اور قیامت کے قائل نہ تھے۔ اور بعض یونانیوں کے نقشِ قدم پر چل کر مادہ اور رُوحوں کو قدیم اور غیر مخلوق خیال کرتے تھے۔ بعض دہریوں کی طرح رُوح کو فانی سمجھتے تھے اور بعض کا فلسفیوں کی طرح یہ مذہب تھا کہ خدائے تعالیٰ رب العالمین اور مدبر بالارادہ نہیں ہے۔ غرض مجذوم کے بدن کی طرح تمام خیالات اُن کے فاسد ہو گئے تھے اور خدائے تعالیٰ کی صفات کاملہ ربوبیت و رحمانیت و رحیمیت اور مالک یوم الدین ہونے پر اعتقاد نہیں رکھتے تھے۔ نہ ان صفتوں کو اس کی ذات سے مخصوص سمجھتے تھے۔ اور نہ ان صفتوں کا کامل طور پر خدائے تعالیٰ میں پایا جانا یقین رکھتے تھے۔ بلکہ بہت سی بدگمانیاں اور بے ایمانیاں اور آلودگیاں ان کے اعتقادوں میں بھر گئی تھیں اور توریت کی تعلیم کو انہوں نے نہایت بدشکل چیز کی طرح بنا کر شرک اور بدی کی بدبو کو پھیلانا شروع کر رکھا تھا۔ پس وہ لوگ خدا تعالیٰ کو جسمانی اور مجسم قرار دینے میں اور اس کی ربوبیت اور رحمانیت اور رحیمیت وغیرہ صفات کے معطل جاننے میں اور ان صفتوں میں دوسری چیزوں کو شریک گردانتے میں اکثر مشرکین کے پیشوا اور سابقین اوّلین میں سے ہیں۔ یہ تو یہودیوں کا حال ہوا۔ مگر افسوس کہ عیسائیوں نے تھوڑے ہی دنوں میں اس سے بدتر اپنا حال بنا لیا اور مذکورہ بالا صداقتوں میں سے کسی صداقت پر قائم نہ رہے۔ اور جو خدا کی صفات کاملہ تھیں وہ سب ابن مریم پر تھاپ دیں۔ اور ان کے مذہب کا خلاصہ یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ

جمیع مافی العالم کا رب نہیں ہے۔ بلکہ مسیح اس کی ربوبیت سے باہر ہے۔ بلکہ مسیح آپ ہی رب ہے اور جو کچھ عالم میں پیدا ہوا وہ بزعم باطل ان کے بطور قاعدۂ کلیہ مخلوق اور حادث نہیں۔ بلکہ ابن مریم عالم کے اندر حدوث پا کر اور صریح مخلوق ہو کر پھر غیر مخلوق اور خدا کے برابر۔ بلکہ آپ ہی خدا ہے اور اس کی عجیب ذات میں ایک ایسا اعجوبہ ہے کہ باوجود حادث ہونے کے قدیم ہے اور باوجود اس کے کہ خدا اپنے اقرار سے ایک واجب الوجود کے ماتحت اور اس کا محکوم ہے۔ مگر پھر بھی آپ ہی واجب الوجود اور آزاد مطلق اور کسی کا ماتحت نہیں۔ اور باوجود اس کے کہ خود اپنے اقرار سے عاجز اور ناتوان ہے۔ مگر پھر بھی عیسائیوں کے بے بنیاد زعم میں قادر مطلق ہے۔ اور عاجز نہیں۔ اور باوجود اس کے کہ خود اپنے نہیں۔ اور باوجود اس کے کہ خود اپنے اقرار سے امور غیبیہ کے بارے میں نادان محض ہے۔ یہاں تک کہ قیامت کی بھی خبر نہیں کہ کب آئے گی۔ مگر پھر بھی نصرانیوں کے خوش عقیدہ کی رُو سے عالم الغیب ہے۔ اور باوجود اس کے کہ خود اپنے اقرار سے اور نیز صحف انبیا کی گواہی سے ایک مسکین بندہ ہے۔ مگر پھر بھی حضرات مسیحیوں کی نظر میں خدا ہے۔ اور باوجود اس کے کہ خود اپنے اقرار سے نیک اور بے گناہ نہیں ہے مگر پھر بھی عیسائیوں کے خیال میں نیک اور بے گناہ ہے۔ غرض عیسائی قوم بھی ایک عجیب قوم ہے۔ جنہوں نے ضدین کو جمع کر دکھایا۔ اور تناقض کو جائز سمجھ لیا۔ اور گو ان کے اعتقاد کے قائم ہونے سے مسیح کا دروغگو

ہونا لازم آیا۔ مگر انہوں نے اپنے اعتقاد کو نہ چھوڑا۔ ایک ذلیل اور عاجز اور ناچیز بندہ کو رب العالمین قرار دیا۔ اور رب العالمین پر ہر طرح کی ذلت اور موت اور درد اور دکھ اور تجسیم اور حلول اور تغیر اور تبدل اور حدوث اور تولد کو روا رکھا ہے۔ نادانوں نے خدا کو بھی ایک کھیل بنا لیا ہے۔ عیسائیوں پر کیا حصر ہے۔ ان سے پہلے کئی عاجز بندے خدا قرار دیئے گئے ہیں۔ کوئی کہتا ہے رام چندر خدا ہے۔ کوئی کہتا ہے نہیں کرشن کی خدائی اس سے قوی تر ہے۔ اسی طرح کوئی بدھ کو کوئی کسی کو کسی کو کوئی خدا ٹھیراتا ہے۔ ایسا ہی آخری زمانہ کے ان سادہ لوحوں نے بھی پہلے مشرکوں کی ریس کر کے ابن مریم کو بھی خدا اور خدا کا فرزند ٹھہرا لیا۔ غرض عیسائی لوگ نہ خداوند حقیقی کو رب العالمین سمجھتے ہیں نہ اُسے رحمان اور رحیم خیال کرتے ہیں۔ اور نہ جزا و سزا اس کے ہاتھ میں یقین رکھتے ہیں۔ بلکہ اُن کے گمان میں حقیقی خدا کے وجود سے زمین اور آسمان خالی پڑا ہوا ہے۔ اور جو کچھ ہے ابن مریم ہی ہے۔ اگر رب ہے تو وہی ہے اگر رحمان ہے تو وہی ہے۔ اگر رحیم ہے تو وہی ہے۔ اگر مالک یوم الدین ہے تو وہی ہے۔ ایسا ہی عام ہندو اور آریہ بھی ان صداقتوں سے منحرف ہیں۔ کیونکہ ان میں سے جو آریہ ہیں وہ تو خدائے تعالیٰ کو خالق ہی نہیں سمجھتے۔ اور اپنی روحوں کا رب اس کو قرار نہیں دیتے۔ اور جو ان میں سے بت پرست ہیں وہ صفت ربوبیت کو اس رب العالمین سے خاص نہیں سمجھتے اور تینتیس کروڑ دیوتا ربوبیت کے کاروبار میں خدائے تعالیٰ کا شریک

ٹھیراتے ہیں اور ان سے مُرادیں مانگتے ہیں - اور یہ ہر دو فریق خدائے تعالیٰ کی رحمانیت کے بھی انکاری ہیں - اور اپنے وید کے رُو سے یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ رحمانیت کی صفت ہرگز خدائے تعالیٰ میں نہیں پائی جاتی - اور جو کچھ دنیا کے لئے خدا نے بنایا ہے یہ خود دنیا کے نیک عملوں کی وجہ سے خدا کو بنانا پڑا - ورنہ پرمیشر خود اپنے ارادے سے کسی سے نیکی نہیں کر سکتا - اور نہ کبھی کی - اسی طرح خدائے تعالیٰ کو کامل طور پر رحیم بھی نہیں سمجھتے - کیونکہ ان لوگوں کا اعتقاد ہے کہ کوئی گنہ گار خواہ کیسا ہی سچے دل سے توبہ کرے اور خواہ وہ سالہا سال تضرع اور زاری اور اعمالِ صالحہ میں مشغول رہے - خدا اس کے گناہوں کو جو اس سے صادر ہو چکے ہیں ہرگز نہیں بخشے گا - جب تک وہ کئی لاکھ جونوں کو بھگت کر اپنی سزا نہ پالے - جب ہی کسی نے ایک گناہ کیا - پھر نہ وہاں توبہ کام آوے نہ بندگی نہ خوفِ الٰہی نہ عشقِ الٰہی نہ اور کوئی عمل صالح گویا وہ جیتے جی ہی مر گیا - اور خدائے تعالیٰ کی رحیمیت سے بکلی نا اُمید ہو گیا علیٰ ہذا القیاس یہ لوگ یوم الجزا پر جس کے رُو سے خدا تعالیٰ مالک یوم الدین کہلاتا ہے - صحیح طور پر ایمان نہیں رکھتے - اور جن طریقوں متذکرہ بالا کے رُو سے انسان اپنی سعادتِ عظمیٰ تک پہنچتا ہے یا شقاوتِ عظمیٰ میں پڑتا ہے اس کامل سعادت اور شقاوت کے ظہور سے انکاری ہیں - اور نجاتِ اخروی کو صرف ایک خیالی اور وہمی طور پر سمجھ رہے ہیں بلکہ وہ نجاتِ ابدی کے قائل ہی نہیں ہیں - اور ان کا مقولہ ہے کہ انسان

کو ہمیشہ کے لئے نہ اس جگہ آرام ہے اور نہ اس جگہ۔ اور نیز ان کے زعم باطل میں دُنیا بھی آخرت کی طرح ایک کامل دارالجزا ہے جس کو دنیا میں بہت سی دولت دی گئی۔ وہ اس کے نیک عملوں کے عوض میں کہ جو کسی پہلے جنم میں اس نے کئے ہوں گے۔ دی گئی ہے۔ اور وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اسی دنیا میں اپنے نفس امّارہ کی خواہشوں کے پورا کرنے میں اس دولت کو خرچ کرے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اسی جہان میں خدائے تعالیٰ کا کسی کو اس غرض سے دولت دینا کہ وہ اس دولت کو فی الحقیقت اپنے اعمال کی جزا سمجھ کر کھانے پینے اور ہر طرح کی عیاشی کے لئے آلہ بنا دے۔ یہ ایک ایسا ناجائز فعل ہے کہ جس کو خدا تعالیٰ کی طرف نسبت کرنا نہایت درجے کی بے ادبی ہے۔ کیونکہ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ گویا ہندوؤں کا پرمیشر آپ ہی لوگوں کو بدفعلی اور ناپاکی میں ڈالنا چاہتا ہے۔ اور قبل اس کے جوان کا نفس پاک ہو نفسانی لذات کے وسیع دروازے اُن پر کھولتا ہے۔ اور پہلے جنموں کے نیک عملوں کا اجر اُن کو یہ دیتا ہے کہ اگلے جنم میں وہ ہر طرح کے اسباب تنعم پا کر اور نفس امّارہ کے پورے پورے تابع بن کر پھر تحت الثریٰ میں جا پڑیں۔ اور ظاہر ہے کہ جس شخص کے خیال میں یہ بھرا ہوا ہے کہ میرے ہاتھ میں جس قدر دولت اور مال اور حشمت اور حکومت ہے یہ میرے ہی اعمال سابقہ کا بدلہ ہے۔ وہ کیا کچھ نفس امارہ کی پیروی نہیں

کریگا لیکن اگر وہ یہ سمجھتا کہ دنیا دار الجزا نہیں ہے بلکہ دار الابتلا ہے۔ اور جو کچھ مجھ کو دیا گیا ہے وہ بطور ابتلا اور آزمائش کے دیا گیا ہے تا یہ ظاہر کیا جاوے کہ میں کس طور پر اس میں تصرف کرتا ہوں۔ کوئی ایسی شئے نہیں ہے جو میری ملکیت یا میرا حق ہو۔ تو ایسا سمجھنے سے وہ اپنی نجات اس بات میں دیکھتا کہ اپنا تمام مال نیک مصارف میں خرچ کرے۔ اور نیز وہ غایت درجہ کا شکر بھی کرتا۔ کیونکہ وہی شخص دلی اخلاص اور محبت سے شکر کر سکتا ہے۔ کہ جو سمجھتا ہے کہ میں نے مفت پایا۔ اور بغیر کسی استحقاق کے مجھ کو ملا ہے۔ غرض آریہ لوگوں کے نزدیک خدائے تعالیٰ نہ رب العالمین ہے نہ رحمان نہ رحیم اور نہ ابدی اور دائمی اور کامل جزا دینے پر قادر ہے۔

اب ہم یہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ برہمو سماج والوں کا معارف مذکورہ بالا کی نسبت کیا حال ہے یعنی وہ ہر چہار صداقتیں کہ جو ابھی مذکور ہوئی ہیں۔ برہمو لوگ ان پر ثابت قدم ہیں۔ یا نہیں۔ سو واضح ہو کہ برہمو لوگ ان چاروں صداقتوں پر جیسا کہ چاہیئے ثبات اور قیام نہیں رکھتے۔ بلکہ ان معارف عالیہ کے کامل مفہوم پر ان کو اطلاع ہی نہیں۔

اوّل خدا کا رب العالمین ہونا کہ جو ربوبیت تامہ سے مراد ہے۔ برہمو لوگوں کی سمجھ اور عقل سے اب تک چھپا ہوا ہے۔ اور وہ لوگ ربوبیت الٰہیہ کا دنیا پر اس سے زیادہ اثر نہیں سمجھتے کہ اس نے کسی وقت یہ تمام عالم معہ اس کی تمام قوتوں اور طاقتوں کے پیدا کیا ہے لیکن اب وہ تمام قوتیں اور طاقتیں مستقل طور پر اپنے اپنے کام میں لگی ہوئی ہیں اور خدائے تعالیٰ کو

قدرت نہیں ہے کہ ان میں کچھ تصرّف کرے یا کچھ تغیر اور تبدّل ظہور میں لاوے۔ اور ان کے زعم باطل میں قوانین تجربہ کی مستحکم اور پائدار بنیاد نے قادر مطلق کو معطل اور بیکار کی طرح کر دیا ہے۔ اور ان میں تصرف کرنے کے لئے کوئی راہ اس پر کھُلا نہیں۔ اور ایسی کوئی بھی تدبیر اس کو یاد نہیں جس سے وہ مثلاً کسی مادہ حار کو اس کی تاثیر حرارت سے روک سکے۔ برودت کے اثروں سے بند کر سکے۔ یا آگ میں اس کی خاصیت احراق کی ظاہر نہ ہونے دے۔ اور اگر اس کو کوئی تدبیر یاد بھی ہے۔ تو صرف انہیں حدود تک جن پر علم انسان کا محیط ہے اِس سے زیادہ نہیں یعنی جو کچھ محدود اور محصور طور پر کوائف و خواص عالم کے متعلق انسان نے دریافت کیا ہے۔ اور جو کچھ تا دم حال بشری تجارب کے احاطے میں آچکا ہے۔ یہیں تک خدا کی قدرتوں کی حد بست ہے۔ اور اس سے بڑھ کر اس کی قدرت تامہ اور ربوبیت عامہ کوئی کام نہیں کر سکتی۔ گویا خدا کی قدرتیں اور حکمتیں ہمگی و تمامی یہی ہیں جن کو انسان دریافت کر چکا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ اعتقاد ربوبیت تامہ اور قدرت کاملہ کے مفہوم سے بکلی منافی ہے۔ کیونکہ ربوبیت تامہ اور قدرت کاملہ وہ ہے کہ جو اس ذات غیر محدود کی طرح غیر محدود ہے۔ اور کوئی انسانی قاعدہ اور قانون اُس پر احاطہ نہیں کر سکتا ؎

نہیں محصور ہرگز راستہ قدرت نمائی کا
خدا کی قدرتوں کا حصر دعوٰے ہے خدائی کا

جاننا چاہیئے کہ جو امر غیر محدود اور غیر محصور ہے۔ وہ کسی قانون کے اندر

آ ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ جو چیز اوّل سے آخر تک قواعد معلومہ مفہومہ کے سلسلہ کے اندر داخل ہو اور کوئی جز اس کا اس سلسلہ سے باہر نہ ہو اور نہ غیر معلوم اور نامفہوم ہو۔ تو وہ چیز محدود ہوتی ہے۔ اب اگر خدائے تعالیٰ کی قدرت کاملہ و ربوبیت تامہ کو قوانین محدودہ محصورہ میں ہی منحصر سمجھا جائے تو جس چیز کو غیر محدود تسلیم کیا گیا ہے اس کا محدود ہونا لازم آجائے گا۔ پس یہ ہمو سماج والوں کی ہی بھاری غلطی ہے کہ وہ خدائے تعالیٰ کی غیر متناہی قدرتوں اور ربوبیتوں کو اپنے تنگ اور منقبض تجارب کے دائرہ میں گھسیڑنا چاہتے ہیں۔ اور نہیں سمجھتے کہ جو امور ایک قانون مشخص مقرر کے نیچے آجائیں۔ ان کا مفہوم محدود ہونے کو لازم پڑا ہوا ہے اور جو حکمتیں اور قدرتیں ذات غیر محدود میں پائی جاتی ہیں۔ ان کا غیر محدود ہونا واجب ہے۔ کیا کوئی دانا کہہ سکتا ہے کہ اس ذات قادر مطلق کو اسی اس طور پر بنانا یاد ہے۔ اور اس سے زیادہ نہیں۔ کیا اس کی غیر متناہی قدرتیں انسانی قیاس کے پیمانہ سے وزن کی جا سکتی ہیں۔ یا اس کی قادرانہ اور غیر متناہی حکمتیں تصرف فی العالم سے کسی وقت عاجز ہو سکتی ہیں۔ بلاشبہ اس کا پُر زور ہاتھ ذرہ ذرہ پر قابض ہے اور کسی مخلوق کا قیام اور بقا اپنی مستحکم پیدائش کے موجب سے نہیں بلکہ اسی کے سہارے اور آسرے سے ہے۔ اور اس کی ربانی طاقتوں کے آگے بے شمار میدان قدرتوں کے پڑے ہیں۔ نہ اندرونی طور پر کسی جگہ انتہا ہے اور نہ بیرونی طور پر کوئی کنارہ ہے۔ جس طرح یہ ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ ایک مشتعل آگ کی تیزی فرو کرنے کے لئے خارج میں کوئی ایسے اسباب پیدا کرے۔ جن سے

اس آگ کی تیزی جاتی رہے اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ اس آگ کی خاصیت احراق دُور کرنے کے لئے اسی کے وجود میں کوئی ایسے اسباب پیدا کردے۔ جن سے خاصیت احراق دُور ہو جائے۔ کیونکہ اس کی غیر متناہی حکمتوں اور قدرتوں کے آگے کوئی بات انہونی نہیں۔ اور جب ہم اس کی حکمتوں اور قدرتوں کو غیر متناہی مان چکے۔ تو ہم پر یہ بھی فرض ہے کہ ہم اس بات کو بھی مان لیں کہ اس کی تمام حکمتوں اور قدرتوں پر ہم کو علم حاصل ہونا ممتنع اور محال ہے۔ سو ہم اس کی ناپیدا کنار حکمتوں اور قدرتوں کے لئے کوئی قانون نہیں بنا سکتے۔ اور جس چیز کی حدود ہمیں معلوم ہی نہیں۔ اس کی پیمائش کرنے سے ہم عاجز ہیں۔ ہم بنی آدم کی دنیا کا نہایت ہی تنگ اور چھوٹا سا دائرہ ہے۔ اور پھر اس دائرہ کا بھی پورا پورا علم ہمیں حاصل نہیں۔ پس اس صورت میں ہماری نہایت ہی کم ظرفی اور سفاہت ہے کہ ہم اس قلیل قلیل پیمانہ سے خدائے تعالیٰ کی غیر محدود حکمتوں اور قدرتوں کو ناپنے لگیں۔ غرض خدائے تعالیٰ کی ربوبیت تامہ اور قدرت کاملہ جو ذرہ ذرہ کے وجود اور بقا کے لئے ہر دم اور ہر لحظہ آب پاشی کر رہی ہے اور جس کے عمیق در عمیق تصرفات تعداد اور شمار سے باہر ہیں۔ اس ربوبیت تامہ سے برہمو سماج والے منکر ہیں۔ ماسوا اس کے برہمو سماج والے ربوبیت الٰہیہ کو روحانی طور پر بھی تام اور کامل نہیں سمجھتے اور خدائے تعالیٰ کو اس قدرت سے عاجز اور درماندہ خیال کرتے ہیں۔ کہ وہ اپنی ربوبیت تامہ کے تقاضا سے اپنا روشن اور لاریب فیہ کلام انسانوں کی ہدایت

کے لئے نازل کرتا۔

اسی طرح وہ خدائے تعالیٰ کی رحمانیت پر بھی کامل طور پر ایمان نہیں لاتے۔ کیونکہ کامل رحمانیت یہ ہے کہ جس طرح خدائے تعالیٰ نے ابدان کی تکمیل اور تربیت کے لئے تمام اسباب اپنے دستِ قدرت سے ظاہر فرمائے ہیں۔ اور اس چند روزہ جسمانی آسائش کے لئے سورج اور چاند اور ہوا اور بادل وغیرہ صدہا چیزیں اپنے ہاتھ سے بنا دی ہیں اسی طرح اُس نے رُوحانی تکمیل اور تربیت کے لئے اور اس عالم کی آسائش کے لئے جس کی شقاوت اور سعادت ابدی اور دائمی ہے رُوحانی نور یعنی اپنا پاک اور روشن کلام دنیا کے انجام کے لئے بھیجا ہوا ور جس علم کی مستعد روحوں کو ضرورت ہے۔ وہ سب علم آپ عطا فرمایا ہو۔ اور جن شکوک اور شبہات میں ان کی ہلاکت ہے۔ ان سب شکوک سے آپ نجات بخشی ہو لیکن اس کامل رحمانیت کو برہمو سماج والے تسلیم نہیں کرتے اور ان کے زعم میں گو خدا نے انسان کے شکم پُر کرنے کے لئے ہر ایک طرح کی مدد کی اور کوئی دقیقہ تائید کا اُٹھا نہ رکھا۔ مگر وہ مدد رُوحانی تربیت میں کر سکا۔ گویا خدا نے رُوحانی تربیت کے بارے میں جو اصلی اور حقیقی تربیت تھی دانستہ دریغ کیا۔ اور اس کے لئے ایسے زبردست اور قوی اور خاص اسباب پیدا نہ کئے۔ جیسے اس نے بدنی تربیت کے لئے پیدا کئے۔ بلکہ انسان کو صرف اسی کی عقل ناقص کے ہاتھ میں چھوڑ دیا۔ اور کوئی ایسا کامل نور اپنی طرف سے اس کی عقل کی امداد کے لئے پیدا نہ کیا جس سے عقل

کی پُرغبار آنکھ روشن ہو کر سیدھا راستہ اختیار کرتی۔ اور سہو اور غلطی کے مہلک خطرات سے بچ جاتی۔ اسی طرح برہمو سماج والے خدائے تعالیٰ کی رحیمیت پر بھی کامل طور پر ایمان نہیں رکھتے۔ کیونکہ کامل رحیمیت یہ ہے۔ کہ خدائے تعالیٰ مستعد رُوحوں کو ان کے فطرتی جوشوں کے مطابق اور اُن کے پرجوش اخلاص کے اندازہ پر اور ان کے صدق سے بھری ہوئی کوششوں کے مقدار پر معارف صافیہ غیر محجوبہ سے ان کو ملبب کرے اور جس قدر وہ اپنے دلوں کو کھولیں۔ اسی قدر ان کے لئے آسمانی دروازے کھولے جائیں اور جس قدر ان کی پیاس بڑھتی جائے اسی قدر ان کو پانی بھی دیا جائے۔ یہاں تک کہ وہ حق الیقین کے شربت خوشگوار سے سیراب ہو جائیں۔ اور شک اور شبہ کی موت سے یکلی نجات حاصل ہو لیکن برہمو سماج والے اس صداقت سے انکاری ہیں۔ اور بقول ان کے انسان کچھ ایسا بدقسمت ہے کہ گو کیسا ہی دلبر حقیقی کے وصال کے لئے تڑپا کرے اور گو اس کی آنکھوں سے دریا بہ نکلے اور گو اس یارِ عزیز کے لئے خاک میں مل جائے مگر وہ ہرگز نہ ملے اور ان کے نزدیک وہ کچھ ایسا سخت دل ہے کہ جس کو اپنے طالبوں پر رحم ہی نہیں اور اپنے خاص نشانوں سے ڈھونڈھنے والوں کو تسلی نہیں بخشتا اور اپنے دلبرانہ تجلّیات سے دردمندوں کا کچھ علاج نہیں کرتا۔ بلکہ ان کو انہیں کے خیالات میں آوارہ چھوڑتا ہے اور اس سے زیادہ ان کو کچھ بھی معرفت عطا نہیں کرتا۔ کہ صرف اپنی اٹکلیں دوڑایا کریں اور انہیں اٹکلوں میں

ہی ساری عمر کھو کر اپنی ظلمانی حالت میں ہی مرجائیں۔ مگر کیا یہ سچ ہے کہ خداوند کریم ایسا ہی سخت دل ہے یا ایسا ہی بے رحم اور بخیل ہے۔ یا ایسا ہی کمزور اور ناتوان ہے کہ ڈھونڈھنے والوں کو حیران چھوڑتا ہے اور کھٹکھٹانے والوں پر اپنا دروازہ بند رکھتا ہے اور جو صدق سے اس کی طرف دوڑتے ہیں ان کی کمزوری پر رحم نہیں کرتا اور اُن کا ہاتھ نہیں پکڑتا اور ان سچے طالبوں کو گڑھے میں گرنے دیتا ہے اور خود لطف فرما کر چند قدم آگے نہیں آتا۔ اور اپنے جلوہ خاص سے مشکلات کے لمبے زمانہ کو کوتاہ نہیں کرتا۔ سبحانہ وتعالیٰ عما یصفون

اسی طرح برہمو سماج والے خدائے تعالیٰ کے مالک یوم الدین ہونے سے بھی بے خبر ہیں۔ کیونکہ یوم الجزا کے مالک ہونے کی حقیقت یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ کی ملکیت تامہ کہ جو تجلیات عظمیٰ پر موقوف ہے ظہور میں آکر پھر اس ملکیت تامہ کی شان کے موافق پوری پوری جزا بندوں کو دیجائے۔ یعنی اول اس مالک حقیقی کی ملکیت تامہ کا ثبوت ایسے کامل الظہور مرتبہ پر ہو جائے کہ تمام اسباب معتادہ بکلی درمیان سے اُٹھ جائیں اور زید وعمر کا دخل درمیان نہ رہے۔ اور مالک واحد قہار کا وجود عریاں طور پر نظر آوے اور جب یہ معرفت کاملہ اپنا جلوہ دکھا چکے تو پھر جزا بھی بطور کامل ظہور میں آوے یعنی من حیث الورود بھی کامل ہو اور من حیث الوجود بھی۔ من حیث الورود اس طرح پر کہ ہر ایک جزا یاب کو جزا کے وارد ہونے کے ساتھ ہی یہ بات معلوم اور متحقق ہو کہ یہ فی الحقیقت اس کے اعمال

کی جزا ہے۔ اور نیز یہ بھی متحقق ہو کہ اس جزا کا وارد کنندہ فی الحقیقت کریم ہی ہے جو رب العالمین ہے کوئی دُوسرا نہیں اور ان دونوں باتوں میں ایسا متحقق ہو کہ کوئی اشتباہ درمیان نہ رہ جائے اور من حیث الوجود اس طرح پر کامل ہو کہ انسان کے دل اور رُوح اور ظاہر اور باطن اور جسم اور جان اور ہر ایک رُوحانی اور بدنی قوت پر ایک دائرہ کی طرح محیط ہو جائے۔ اور نیز دائمی اور لازوال اور غیر منقطع ہو تا وہ شخص جو نیکیوں میں سبقت لے گیا ہے۔ اپنی اس سعادت عظمٰی کو کہ جو تمام سعادتوں کا انتہائی مرتبہ ہے اور وہ شخص کہ جو بدیوں میں سبقت لے گیا ہے اپنی اس شقاوت عظمٰی کو کہ جو تمام شقاوتوں کی آخری حد ہے۔ پہنچ جائے۔ اور تا ہر ایک فریق اس اعلیٰ درجے کے مکافات کو پالے جو اس کے لئے ممکن ہے۔ یعنی اس کامل اور دائمی مکافات کو پالے کہ جو اس عالم بے بقا اور زوال پذیر میں۔ جس کا تمام رنج وراحت موت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے بمنصہ ظہور نہیں آسکتی۔ بلکہ اس کے کامل ظہور کے لئے مالک حقیقی نے اپنے لطف کامل اور قہر عظیم کے دکھلانے کی غرض سے یعنی جمالی وجلالی صفتوں کی پوری پوری تجلی ظاہر کرنے کے قصد سے ایک اور عالم جو ابدی اور لازوال ہے۔ مقرر کر رکھا ہے۔ تا خدا تعالیٰ میں جو صفت مجازات ہے۔ جس کا کامل طور پر اس منقبض اور فانی عالم میں ظہور نہیں ہوسکتا وہ اس ابدی اور وسیع عالم میں ظہور پذیر ہو جائے اور تا ان تجلیات تامہ اور کاملہ سے انسان اس اعلیٰ درجہ کے مشہود تام تک بھی پہنچ جائے کہ جو اُس

کی بشری طاقتوں کے لئے حدِ امکان میں داخل ہے۔ اور چونکہ اعلیٰ درجہ کی مکافات عند العقل اسی میں منحصر ہے کہ جو امر بطور جزا وارد ہوئے وہ انسان کے ظاہر و باطن اور جسم و جان پر بتمام و کمال دائمی و لازمی طور پر محیط ہو جائے۔ اور نیز اعلیٰ درجہ کا یقین مالک حقیقی کے وجود کی نسبت اسی بات پر موقوف ہے کہ وہ مالک حقیقی اسباب معتادہ کو بکلی نیست و نابود کر کے عریاں طور پر جلوہ گر ہو اس لئے یہ صداقت قصوی جس سے مطلب انتہائی معرفت اور انتہائی مکافات ہے تبھی متحقق ہو گی کہ جب وہ تمام باتیں مذکورہ بالا متحقق ہو جائیں کہ جو عند العقل اس کی تعریف میں داخل ہیں۔ کیونکہ انتہائی معرفت بجز اس کے عند العقل ممکن نہیں۔ کہ مالک حقیقی کا جمال بطور حق الیقین مشہود ہو یعنی ظہور اور بروز تام ہو۔ جس پر زیادت متصور نہ ہو۔ علیٰ ہذا القیاس انتہائی مکافات بھی بجز اس کے عند العقل غیر ممکن ہے۔ کہ جیسے جسم اور جان دونوں دنیا کی زندگی میں مل کر فرماں بردار یا نافرمان اور سرکش تھے۔ ایسا ہی مکافات کے وقت وہ دونوں موردِ انعام ہوں۔ یا دونوں سزا میں پکڑے جائیں اور مکافات کاملہ کا بحر مواج یکساں ظاہر و باطن پر اپنے احاطۂ تام سے محیط اور مشتمل ہو جائے۔ لیکن برہمو سماج والے اس صداقت سے بھی انکاری ہیں بلکہ اس صداقت قصوی کا وجود اُن کے نزدیک متحقق ہی نہیں۔ اور بزعم اُن کے انسان کی قسمت میں نہ انتہائی معرفت کا پانا مقدر ہے نہ انتہائی مکافات کا۔ اور مکافات ان کے نزدیک فقط ایک خیالی پلاؤ ہے۔ جو صرف اپنے ہی بے بنیاد تصورات سے پکایا جائے گا نہ حقیقی طور پر کوئی جزا خدا تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر وارد ہو گی

نہ کوئی سزا بلکہ خود تراشیدہ خیالات ہیں خوش حالی یا بدحالی کے موجب ہو جائینگے
اور کوئی ایسا ظاہری و باطنی امر نہیں ہوگا کہ جو خاص خدا تعالیٰ کے ارادے سے
نیک بندوں پر بصورت نعمت اور بد بندوں پر بصورتِ عذاب اترے گا پس
ان کا یہ مذہب نہیں ہے کہ امر مجازات کا خدا مالک ہے! اور وہی اپنے نیک
بندوں پر اپنے خاص ارادے سے خوشحالی اور لذات دائمی کا فیضان
کرے گا جس لذتِ کاملہ کو سعید لوگ نہ صرف باطنی طور پر بلکہ صور مشہودہ اور
محسوسہ میں بھی مشاہدہ کریں گے اور قوی انسانیہ میں سے کوئی قوت ظاہری
ہو یا باطنی اپنے مناسب حال لذت اٹھانے سے محروم نہیں رہے گی اور
جسم اور جان دونوں راحت یا عذاب اُخروی میں یعنی جیسا کہ صورت ہو شریک
ہو جائیں گے۔ غرض برہمو سماج والوں کا اعتقاد بالکل اس صداقت کے
برخلاف اور اس کے مفہوم کامل کے منافی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی کور باطنی
سے نجاتِ اُخروی کے جسمانی سامان کو کہ جو ظاہری قوتوں کے مناسب حال
سعادتِ عظمیٰ کی تکمیل کے لئے قرآن شریف میں بیان کیا گیا ہے اور اسی طرح
عذابِ اُخروی کے جسمانی سامان کو کہ جو ظاہری قوتوں کے مناسب حال شقاوتِ
عظمیٰ کی تکمیل کے لئے فرقان مجید میں مندرج ہے۔ موردِ اعتراض سمجھتے ہیں
مگر ایسی سمجھ پر پتھر پڑیں کہ جو ایک بدیہی اور کامل صداقت کو عیب کی صورت میں
تصور کیا جائے۔ افسوس یہ لوگ کیوں نہیں توجہ خاص فرما کر امر مکافات کو
کامل طور پر نازل کرے۔ اور کامل طور پر نازل ہونے کے یہی معنی ہیں کہ وہ
مکافات تمام ظاہر و باطن پر مستولی ہو جائے۔ اور کوئی ایسی ظاہری یا باطنی

فوت باقی نہ رہے۔ جس کو اس مکافات سے حصّہ نہ پہنچا ہو۔ یہ وہی مکافاتِ عظمیٰ کا انتہائی مرتبہ ہے۔ جس کو قرآنِ مجید نے دُوسرے لفظوں میں بہشت اور دوزخ کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ اور اپنی کامل اور روشن کتاب میں بتلا دیا ہے۔ کہ وہ بہشت اور دوزخ روحانی اور جسمانی دونوں قسم کے مکافات پر کامل طور پر مشتمل ہے اور ان دونوں قسموں کو کتاب مندرج میں مفصل طور پر بیان فرما دیا ہے۔ اور سعادتِ عظمیٰ اور شقاوتِ عظمیٰ کی حقیقت کو بخوبی کھول دیا ہے مگر جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں۔ اس صداقت قصویٰ اور نیز دوسری گزشتہ بالا صداقتوں سے برہمو سماج والے ناآشنا محض ہیں۔

چھٹی صداقت جو سورہ فاتحہ میں مندرج ہے ایاک نعبد وایاک نستعین ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اے صاحب صفاتِ کاملہ اور مبدءِ فیوض ازلیہ ہم تیری ہی پرستش کرتے ہیں۔ اور پرستش وغیرہ ضرورتوں اور حاجتوں میں مدد بھی تجھ سے ہی چاہتے ہیں۔ یعنی خالصاً معبود ہمارا تو ہی ہے اور تیرے تک پہنچنے کے لئے کوئی اور دیوتا ہم اپنا ذریعہ قرار نہیں دیتے نہ کسی انسان کو نہ کسی بُت کو نہ اپنی عقل اور علم کو کچھ حقیقت سمجھتے ہیں۔ اور ہر بات میں تیری ذات قادرِ مطلق سے مدد چاہتے ہیں۔ یہ صداقت بھی ہمارے مخالفین کی نظر سے چھپی ہوئی ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ بُت پرست لوگ بجز ذاتِ واحد خدا تعالیٰ کے اور اور چیزوں کی پرستش کرتے ہیں۔ اور آریہ سماج والے اپنی رُوحانی طاقتوں کو غیر مخلوق سمجھ کر اُن کے زور سے مکتی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ برہمو سماج والے الہام کی روشنی سے مونہہ پھیر کر اپنی عقل کو ایک دیوی قرار دے

بیٹھے ہیں۔ جو کہ ان کے زعم باطل میں خدا تک پہنچانے میں اختیار کلی رکھتی ہے اور سب الٰہی اسرار پر محیط اور متصرف ہے۔ سو وہ لوگ بجائے خدا کی پرستش اور استمداد کے اسی سے ایاک نستعین کا خطاب کر رہے ہیں۔ اور شرک خفی میں گرفتار اور مبتلا ہیں۔ اور جب منع کیا جائے تو کہتے ہیں کہ عقل عطیات الٰہیہ ہے۔ اور اسی غرض سے دی گئی ہے کہ تا انسان اپنی معاش اور مہمات میں اس کو استعمال میں لاوے پس عطیہ الٰہی کا استعمال میں لانا شرک نہیں بن سکتا۔ سو واضح ہو کہ یہ ان کی غلطی ہے اور بار ہا یہ امر معرض بیان میں آ گیا ہے کہ جس یقین کامل اور معارف حقہ پر ہماری نجات موقوف ہے۔ ان مقاصد عالیہ کے حصول کے لئے عقل ذریعہ نہیں بن سکتی۔ ہاں ان معارف کے حاصل کرنے کے بعد ان کی صداقت اور سچائی کو سمجھ سکتی ہے لیکن وہ انکشاف صحیح اور کامل فقط اس پاک اور صاف روشنی سے ہوتا ہے کہ جو خدائے تعالیٰ کی ذات میں موجود ہے۔ اور عقل کی دُود آمیز اور ناقص روشنی جو انسان میں موجود ہے۔ اس جگہ عاجز ہے۔ سو شرک اس طرح لازم آتا ہے کہ برہمو سماج والے خدا کے اس روشن کلام سے کہ جو انکشاف صحیح اور کامل کا مدار ہے منہ پھیر کر اور اس سے بکلی بے نیازی ظاہر کر کے اپنی ہی عقل ناقص کو رہبر مطلق ٹھہراتے ہیں۔ اور بنائے کار بناتے ہیں۔ سو ان کا دل بیمار اس دھوکہ میں پڑا ہوا ہے کہ جس منزل عالی تک الٰہی توفیق اور ربانی تجلیات پہنچا سکتے ہیں۔ اس منزل تک ان کی اپنی ہی عقل پہنچا دے گی۔ اب ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کیا شرک ہوگا کہ اپنی عقل کی طاقت کو ربانی طاقت کے

مساوی بلکہ عمدہ ترخیال کر رہے ہیں۔ سو دیکھئے وہی بات سچ نکلی یا نہیں کہ وہ بجائے خدا کے عقل سے ایاک نستعین پکار رہے ہیں۔

عیسائیوں کا حال بیان کرنا کچھ ضرورت ہی نہیں۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ حضرات عیسائی بجائے اس کے کہ خداوند تعالیٰ کی خالص طور پر پرستش کریں۔ مسیح کی پرستش میں مشغول ہیں۔ اور بجائے اس کے کہ اپنے کاروبار میں خدا سے مدد چاہیں۔ مسیح سے مدد مانگتے رہتے ہیں۔ اور ان کی زبانوں پر ہر وقت ربنا المسیح ربنا المسیح جاری ہے۔ سو وہ لوگ مضمون ایاک نعبد و ایاک نستعین پر عمل کرنے سے محروم اور راندۂ درگاہِ الٰہی ہیں

ساتویں صداقت جو سورہ فاتحہ میں درج ہے اھدنا الصراط المستقیم ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم کو وہ راستہ دکھلا اور اس راہ پر ہم کو ثابت اور قائم کر کہ جو سیدھا ہے جس میں کسی نوع کی کجی نہیں اس صداقت کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کی حقیقی دعا یہی ہے کہ وہ خدا تک پہنچنے کا سیدھا راستہ طلب کرے۔ کیونکہ ہر ایک مطلوب کے حاصل کرنے کے لئے طبعی قاعدہ یہ ہے۔ کہ ان وسائل کو حاصل کیا جائے جن کے ذریعہ سے وہ مطلب ملتا ہے۔ اور خدا نے ہر ایک امر کی تفصیل کے لئے یہی قانونِ قدرت ٹھہرا رکھا ہے۔ کہ جو اس کے حصول کے وسائل ہیں وہ حاصل کئے جائیں اور جن راہوں پر چلنے سے وہ مطلب مل سکتا ہے وہ راہیں اختیار کی جائیں اور جب انسان صراط مستقیم پر ٹھیک ٹھیک قدم مارے اور جو حصولِ مطلب کی راہیں ہیں ان پر چلنا اختیار کرے تو پھر مطلب خود بخود

حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کہ ان راہوں کے چھوڑ دینے سے جو کسی مطلب کے حصول کے لئے بطور وسائل کے ہیں۔ یوں ہی مطلب حاصل ہو جائے۔ بلکہ قدیم سے یہی قانونِ قدرت بندھا ہوا چلا آتا ہے۔ کہ ہر ایک مقصد کے حصول کے لئے ایک مقررہ طریقہ ہے۔ جب تک انسان اس طریقہ مقرّرہ پر قدم نہیں مارتا تب تک وہ امر اس کو حاصل نہیں ہوتا۔ پس وہ شئے جس کو محنت اور کوشش اور دعا اور تضرع سے حاصل کرنا چاہیئے۔ صراط مستقیم ہے۔ جو شخص صراط مستقیم کی طلب میں کوشش نہیں کرتا۔ اور نہ اس کی کچھ پرواہ رکھتا ہے۔ وہ خدا کے نزدیک ایک کجرو آدمی ہے۔ اور اگر وہ خدا سے بہشت اور عالم ثانی کی راحتوں کا طالب ہو تو حکمت الٰہی اسے یہی جواب دیتی ہے کہ اے نادان! اوّل صراط مستقیم کو طلب کر۔ پھر یہ سب کچھ تجھے آسانی سے مل جائے گا۔ سو سب دعاؤں سے مقدم دعا جس کی طالب حق کو اشد ضرورت ہے وہی طلب صراط مستقیم ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ہمارے مخالفین اس صداقت پر قدم مارنے سے بھی محروم ہیں۔ عیسائی لوگ تو اپنی دعا میں روٹی ہی مانگا کرتے ہیں۔ اور اگر کھا پی کر اور پیٹ بھر کر بھی گر جا میں آویں پھر بھی جھوٹ موٹ اپنے تئیں بھوکے ظاہر کر کے روٹی مانگتے رہتے ہیں۔ گویا ان کا مطلوب اعظم روٹی ہی ہے۔ وبس۔

آریہ سماج والے اور دوسرے ان کے بُت پرست بھائی اپنی دعا ؤں میں جنم مرن سے بچنے کے لئے یعنی اواگون سے جو اُن کے زعم باطل میں

ٹھیک اور درست ہے۔ طرح طرح کے اشلوک پڑھا کرتے ہیں اور صراطِ مستقیم کو خدا سے نہیں مانگتے۔ علاوہ اس کے اللہ تعالیٰ نے تو اس جگہ جمع کا لفظ بیان کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کوئی انسان ہدایت طلب کرنے اور انعام الٰہی پانے سے ممنوع نہیں ہے۔ مگر بموجب اصول آریہ سماج کے ہدایت طلب کرنا گنہ گار کے لئے ناجائز ہے۔ اور خدا اس کو ضرور سزا دے گا۔ اور ہدایت پانا نہ پانا اس کے لئے برابر ہے۔

برہمو سماج والوں کا دعاؤں پر کچھ ایسا اعتقادی نہیں۔ وہ ہر وقت اپنی عقل کے گھمنڈ میں رہتے ہیں۔ اور نیز ان کا یہ بھی مقولہ ہے کہ کسی خاص دعا کو بندگی اور عبادت کے لئے خاص کرنا ضروری نہیں انسان کو اختیار ہے جو چاہے دُعا مانگے۔ مگر یہ اُن کی سراسر نادانی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اگرچہ جزوی حاجات صدہا انسان کو لگی ہوئی ہیں۔ مگر حاجتِ اعظم جس کا دن رات اور ہر ایک دم فکر کرنا چاہیئے۔ صرف ایک ہی ہے۔ یعنی یہ کہ انسان اُن طرح طرح کے حجبِ ظلمانیہ سے نجات پا کر معرفت کامل کے درجہ تک پہنچ جائے اور کسی طرح کی نابینائی اور کور باطنی اور بے مہری اور بے وفائی باقی نہ رہے۔ بلکہ خدا کو کامل طور پر شناخت کر کے اور اس کی خاص محبت سے پُر ہو کر مرتبہ وصال الٰہی کا جس میں اُس کی سعادت تامہ ہے پالیوے۔ یہی ایک دُعا ہے جس کی انسان کو سخت حاجت ہے۔ اور جس پر اس کی ساری سعادت موقوف ہے سو اس کے حصول

کا سیدھا راستہ یہی ہے کہ اھدنا الصراط المستقیم کہے۔ کیونکہ انسان کے لئے ہر ایک مطلب کے پانے کا یہی ایک طریق ہے۔ کہ جن راہوں پر چلنے سے وہ مطلب حاصل ہوتا ہے۔ ان راہوں پر مضبوطی سے قدم مارے اور وہی راستہ اختیار کرے کہ جو سیدھا منزل مقصود تک پہنچتا ہے۔ اور بے راہیوں کو چھوڑ دے۔ اور یہ بات نہایت بدیہی ہے کہ ہر شئے کے حصول کے لئے خدا نے اپنے قانون قدرت میں صرف ایک ہی راستہ ایسا رکھا ہے جس کو سیدھا کہنا چاہیئے۔ اور جب تک ٹھیک ٹھیک وہی راستہ اختیار نہ کیا جائے ممکن نہیں کہ وہ چیز حاصل ہو سکے۔ جس طرح خدا کے تمام قواعد قدیم سے مقرر اور منضبط ہیں۔ ایسا ہی نجات اور سعادتِ آخروی کی تحصیل کے لئے ایک خاص طریق مقرر ہے۔ جو مستقیم اور سیدھا ہے۔ سو دعا میں وضع استقامت یہی ہے کہ اسی طریق مستقیم کو خدا سے مانگا جائے۔

آٹھویں اور نویں اور دسویں صداقت جو سورۃ فاتحہ میں درج ہے:

صِراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین ؎

جس کے یہ معنی ہیں کہ ہم کو ان سالکین کا راستہ بتلا جنہوں نے ایسی راہیں اختیار کیں کہ جن سے ان پر تیرا انعام وارد ہوا۔ اور ان لوگوں کی راہوں سے بچا۔ جنہوں نے لاپروائی سے سیدھی راہ پر قدم مارنے کے لئے کوشش نہ کی اور اس بات سے تیری تائید سے محروم رہ کر گمراہ رہے۔

یہ تین صداقتیں ہیں جن کی تفصیل یہ ہے کہ بنی آدم اپنے اقوال ا فعال اور اعمال اور نیّات کے رو سے تین قسم کے ہوتے ہیں بعض سچے دل سے خدا کے طالب ہوتے ہیں۔ اور صدق اور عاجزی سے خدا کی طرف رجوع کرتے ہیں پس خدا بھی ان کا طالب ہو جاتا ہے۔ اور رحمت اور انعام کے ساتھ ان پر رجوع کرتا ہے اس حالت کا نام انعامِ الٰہی ہے۔ اسی کی طرف آیت ممدوحہ میں اشارہ فرمایا اور کہا صراط الذین انعمت علیھم یعنی وہ لوگ ایسا صاف اور سیدھا راستہ اختیار کرتے ہیں جس سے فیضانِ رحمت الٰہی کے مستحق ٹھہر جاتے ہیں۔ اور بباعث اس کے کہ ان میں اور خدا میں کوئی حجاب باقی نہیں رہتا۔ اور بالکل رحمت الٰہی کے محاذی آپڑتے ہیں۔ اس جہت سے انوار فیضانِ الٰہی کے اُن پر وارد ہوتے ہیں۔

دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں کہ جو دیدہ دانستہ مخالفت کا طریق اختیار کر لیتے ہیں۔ اور دشمنوں کی طرح خدا سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ سو خدا بھی ان سے منہ پھیر لیتا ہے۔ اور رحمت کے ساتھ ان پر رجوع نہیں کرتا۔ اس کا باعث بھی ہوتا ہے کہ وہ عداوت اور بیزاری اور غضب اور غیظ اور نارضامندی جو خدا کی نسبت ان کے دلوں میں چھپی ہوئی ہوتی ہے وہی ان میں اور خدا میں حجاب ہو جاتی ہے۔ اس حالت کا نام غضب الٰہی ہے۔ اسی کی طرف خدائے تعالیٰ نے اشارہ فرما کر کہا۔ غیر المغضوب علیھم۔

تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جو خدا سے لاپرواہ رہتے ہیں اور سعی اور کوشش سے اس کو طلب نہیں کرتے وہ بھی ان کے ساتھ لاپرواہی کرتا ہے اور ان کو

اپنا راستہ نہیں دکھلاتا۔ کیونکہ وہ لوگ راستہ طلب کرنے میں آپ سستی کرتے ہیں اور اپنے تئیں اس فیض کے لائق نہیں بناتے کہ جو خدا کے قانونِ قدیم میں محنت اور کوشش کرنے والوں کے لئے مقرر ہے۔ اس حالت کا نام اضلالِ الٰہی ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ خدا نے ان کو گمراہ کیا۔ یعنی جبکہ انہوں نے ہدایت پانے کے طریقوں کو بجد و جہد طلب نہ کیا۔ تو خدا نے بہ پابندی اپنے قانونِ قدیم کے ان کو ہدایت بھی نہ دی اور اپنی تائید سے محروم رکھا۔ اسی کی طرف اشارہ فرمایا اور کہا وَلَا الضَّآلِّیْن

غرض ماحصل اور خلاصہ ان تینوں صداقتوں کا یہ ہے کہ جیسے انسان کی خدا کے ساتھ تین حالتیں ہیں۔ ایسا ہی خدا بھی ہر ایک حالت کے موافق ان کے ساتھ جدا جدا معاملہ کرتا ہے۔ جو لوگ اس پر راضی ہوتے ہیں اور دلی محبت اور صدق سے اس کے خواہاں ہو جاتے ہیں۔ خدا بھی ان پر راضی ہو جاتا ہے اور اپنی رضامندی کے انوار اُن پر نازل کرتا ہے اور جو لوگ اس سے منہ پھیر لیتے ہیں اور عمداً مخالفت اختیار کرتے ہیں خدا بھی مخالف کی طرح ان سے معاملہ کرتا ہے اور جو لوگ اس کی طلب میں سستی اور لاپروائی کرتے ہیں۔ خدا بھی اُن سے لاپروائی کرتا ہے۔ اور ان کو گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے۔ غرض جس طرح آئینہ میں انسان کو وہی شکل نظر آتی ہے کہ جو حقیقت میں شکل رکھتا ہے اسی طرح حضرت احدیت کہ جو ہر ایک کدورت سے مصفیٰ اور پاک ہے محبت والوں کے ساتھ محبت رکھتا ہے غضب والوں پر غضبناک ہے۔ لاپرواہوں کے ساتھ لاپرواہ ہے۔ رُکنے والوں سے رُک جاتا ہے اور جھکنے والوں کی طرف جھکتا

ہے چاہنے والوں کو چاہتا ہے اور نفرت کرنے والوں سے نفرت کرتا ہے۔ اور
جس طرح آئینہ کے سامنے جو انداز اپنا بناؤ گے وہی انداز آئینہ میں بھی نظر آئیگا۔
ایسا ہی خداوند تعالیٰ کے رُوبرو جس انداز سے کوئی چلتا ہے، وہی انداز خدا کی
طرف سے اس کے لئے موجود ہے اور جن لباسوں کو بندہ اپنے لئے آپ
اختیار کر لیتا ہے۔ وہی تخم بویا ہوا اُکا اس کو دیا جاتا ہے۔ جب انسان ہر ایک
طرح کے حجابوں اور کدورتوں اور آلائشوں سے اپنے دل کو پاک کر لیتا ہے
اور صحن سینہ اس کے کا ماسوا سے یا سوائے اللہ سے بالکل خالی ہو جاتا ہے تو
اس کی ایسی مثال ہوتی ہے۔ جیسے کوئی اپنے مکان کا دروازہ جو آفتاب کی طرف
کھولتا ہے اور سُورج کی کرنیں اس کے گھر کے اندر چلی آتی ہیں لیکن جب بندہ ناراستی
اور دروغ اور طرح طرح کی آلائشوں کو آپ اختیار کر لیتا ہے اور خدا کو حقیر
چیز کی طرح خیال کر کے چھوڑ دیتا ہے۔ تو اس کی ایسی مثال ہوتی ہے۔ جیسے
کوئی روشنی کو ناپسند کر کے اور اس سے بغض رکھ کر اپنے گھر کے تمام دروازے
بند کر دے۔ تا ایسا نہ ہو کہ کسی طرف سے آفتاب کی شعاعیں اس کے گھر کے
اندر آ جائیں۔ اور جب انسان بباعث جذبات نفسانی یا ننگ و ناموس یا
تقلید قوم وغیرہ طرح طرح کی غلطیوں اور آلائشوں میں گرفتار ہوا اور سستی اور
تکاسل اور لاپروائی سے ان آلائشوں سے پاک ہونے کے لئے کچھ سعی اور کوشش
نہ کرے تو اس کی ایسی مثال ہوتی ہے جیسے کوئی اپنے گھر کے دروازوں کو بند پاوے۔
اور تمام گھر میں اندھیرا بھرا ہوا دیکھے اور پھر اُٹھ کر دروازوں کو نہ کھولے اور
ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھا رہے اور دل میں یہ کہے کہ اب اس وقت کون اُٹھے۔

اور کون اتنی تکلیف اٹھاوے۔

یہ تینوں مثالیں ان تینوں حالتوں کی ہیں۔ جو انسان کے اپنے ہی فعل یا اپنی ہی سستی سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ جن میں سے پہلی حالت کا نام حسب تصریح گذشتہ کے انعامِ الٰہی اور دوسری حالت کا نام غضب الٰہی اور تیسری حالت کا نام اضلالِ الٰہی ہے۔ ان تینوں صداقتوں سے بھی ہمارے مخالفین بے خبر ہیں۔ کیونکہ برہمو سماج والوں کو اس صداقت سے بالکل اطلاع نہیں ہے۔ جس کی رُو سے خدائے تعالیٰ سرکش اور غضب ناک بندوں کے ساتھ غضب ناک کا معاملہ کرتا ہے۔ چنانچہ برہمو صاحبوں میں سے ایک صاحب نے اس بارے میں انہیں دنوں میں ایک رسالہ بھی لکھا ہے۔ جس میں صاحب موصوف خدا کی کتابوں پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ان میں غضب کی صفت خدائے تعالیٰ کی طرف کیونکر منسوب کی گئی ہے۔ کیا خدا ہماری کمزوریوں پر چڑتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر صاحب راقم کو اس صداقت کی کچھ بھی خبر ہوتی۔ تو کیوں وہ ناحق اپنے اوقات ضائع کر کے ایک ایسا رسالہ چھپواتے جس سے ان کی کم فہمی ہر ایک پر کھل گئی ہے۔ اور ان کو باوجود دعویٰ عقل کے یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ خدا کا غضب بندے کی حالت کا ایک عکس ہے۔ جب انسان کسی مخالفانہ شر سے محجوب ہو جائے اور خدا سے دوسری طرف منہ پھیر لے تو کیا وہ اس لائق رہ سکتا ہے کہ جو سچے محبوّں اور صادقوں پر فیضانِ رحمت ہوتا ہے اس پر بھی وہی فیضان ہو جائے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ خدا کا قانونِ قدیم جو ابتدا سے چلا آیا ہے جس کو ہمیشہ راستبازا ور صادق

آدمی تجربہ کرتے رہے ہیں۔ اور اب بھی صحیح تجارب سے اس کی سچائیوں کو مشاہدہ کرتے ہیں۔ وہ یہی قانون ہے کہ جو شخص ظلمانی حجابوں سے نکل کر سیدھا خدائے تعالیٰ کی طرف اپنے روح کا مُنہ پھیر کر اس کے آستانہ پر گر پڑتا ہے۔ اُسی پر فیضانِ رحمتِ خاصہ ایزدی کا ہوتا ہے۔ اور جو شخص اس طریق کے برخلاف کوئی دُوسرا طریق اختیار کر لیتا ہے تو بالضرور جوامر رحمت کے برخلاف ہے۔ یعنی غضب الٰہی اس پر وارد ہو جاتا ہے۔ اور غضب کی اصل حقیقت یہی ہے کہ جب ایک شخص اس طریقِ مستقیم کو چھوڑ دیتا ہے کہ جو قانونِ الٰہی میں افاضۂ رحمتِ الٰہی کا طریق ہے۔ تو فیضانِ رحمت سے محروم رہ جاتا ہے اسی محرومی کی حالت کا نام غضب الٰہی ہے۔ اور چونکہ انسان کی زندگی اور آرام اور راحت خدا کے فیض سے ہی ہے۔ اس جہت سے جو لوگ فیضانِ رحمت کے طریق کو چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ خدا کی طرف سے اسی جہان میں یا دُوسرے جہان میں طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ جس کے شاملِ حال رحمتِ الٰہی نہیں ہے۔ ضرور ہے کہ انواع اقسام کے عذاب رُوحانی و بدنی اس کی طرف منہ کریں۔ اور چونکہ خدا کے قانون میں یہی انتظام مقرر ہے۔ کہ رحمتِ خاصہ انہیں کے شاملِ حال ہوتی ہے کہ جو رحمت کے طریق کو یعنی دعا اور توحید کو اختیار کرتے ہیں۔ اس باعث سے جو لوگ اس طریق کو چھوڑ دیتے ہیں وہ طرح طرح کی آفات میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے۔ قل ما یعبؤا بکم ربی لولا دعاؤکم واللہ غنی عن العلمین یعنی ان کو کہہ دے کہ

میرا خدا تمہاری پرواہ کیا رکھتا ہے اگر تم دُعا نہ کرو اور اس کے فیضان کے خواہاں نہ ہو۔ خدا کو تو کسی کی زندگی اور وجود کی حاجت نہیں۔ وہ تو بے نیاز مطلق ہے۔

اور آریہ سماج والے اور عیسائی بھی ان تینوں صداقتوں میں سے پہلی اور تیسری صداقت سے بے خبر ہیں۔ کوئی اُن میں سے یہ اعتراض کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ سب لوگوں کو کیوں ہدایت نہیں دیتا۔ اور کوئی یہ اعتراض کر رہا ہے کہ خدا میں صفتِ اضلال کیونکہ پائی جاتی ہے۔ جو لوگ خدا تعالیٰ کی ہدایت کی نسبت معترض ہیں۔ وہ نہیں سوچتے کہ ہدایت الٰہی انہیں کے شامل حال ہوتی ہے۔ کہ جو ہدایت پانے کے لئے کوشش کرتے ہیں۔ اور ان راہوں پر چلتے ہیں۔ جن راہوں پر چلنا فیضان رحمت کے لئے ضروری ہے۔ اور جو لوگ اضلال الٰہی کی نسبت معترض ہیں۔ ان کو یہ خیال نہیں آتا کہ خدائے تعالیٰ اپنے قواعد مقررہ کے ساتھ ہر ایک انسان سے مناسب حال معاملہ کرتا ہے۔ اور جو شخص سستی اور تکاسل سے اس کے لئے کوشش کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں قدیم سے اس کا یہی قاعدہ مقرر ہے کہ وہ اپنی تائید سے ان کو محروم رکھتا ہے۔ اور انہیں کو اچھی راہیں دکھلاتا ہے۔ جو اُن راہوں کے لئے بدل و جان سعی کرتے ہیں۔ بھلا یہ کیونکر ہو سکے۔ کہ جو شخص نہایت لاپروائی سے سستی کرتا ہے وہ ایسا ہی خدا کے فیض سے مستفیض ہو جائے۔ جیسے وہ شخص کہ جو تمام عقل اور تمام زور اور تمام اخلاص سے اس کو ڈھونڈتا ہے۔ اسی کی طرف ایک دُوسرے

مقام میں بھی اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے اور وہ یہ ہے والّذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا یعنی جو لوگ ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں ہم ان کو بالضرور اپنی راہیں دکھلا دیا کرتے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ دس صداقتیں جو سورہ فاتحہ میں درج ہیں کس قدر عالی اور بے نظیر صداقتیں ہیں۔ جن کے دریافت کرنے سے ہمارے تمام مخالفین قاصر رہے۔ اور پھر دیکھنا چاہیئے کہ کس ایجاز اور لطافت سے اقل قلیل عبارت میں ان کو خدائے تعالیٰ نے بھر دیا ہے۔ اور پھر اس طرف خیال کرنا چاہیئے کہ علاوہ ان سچائیوں کے اور اس کمالِ ایجاز کے دوسرے کیا کیا لطائف ہیں۔ جو اس سورۂ مبارکہ میں بھرے ہوئے ہیں۔ اگر ہم اس جگہ ان سب لطائف کو بیان کریں۔ تو یہ مضمون ایک دفتر بن جائے گا۔ صرف چند لطائف بطور نمونہ بیان کئے جاتے ہیں:

اوّل یہ لطیفہ ہے کہ خدائے تعالیٰ نے اس سُورہ فاتحہ میں دُعا کرنے کا ایسا طریقہ حسنہ بتلایا ہے جس سے خوب تر طریقہ پیدا ہونا ممکن نہیں۔ اور جس میں وہ تمام امور جمع ہیں جو دُعا میں دلی جوش پیدا کرنے کے لئے نہایت ضروری ہیں۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ قبولیت دُعا کے لئے ضرور ہے کہ اس میں ایک جوش ہو کیونکہ جس دُعا میں جوش نہ ہو وہ صرف لفظی بڑبڑ ہے۔ حقیقی دعا نہیں۔ مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ دُعا میں جوش پیدا ہونا ہر ایک وقت انسان کے اختیار میں نہیں۔

بلکہ انسان کے لئے اشد ضرورت ہے کہ دعا کرنے کے وقت جو امور دلی جوش کے محرک ہیں وہ اس کے خیال میں حاضر ہوں اور یہ بات ہر ایک عاقل پر روشن ہے کہ دلی جوش پیدا کرنے والی صرف دو ہی چیزیں ہیں۔ ایک خدا کو کامل اور قادر اور جامع صفاتِ کاملہ خیال کر کے اس کی رحمتوں اور کرموں کو ابتدا سے انتہا تک اپنے وجود اور بقا کے لئے ضروری دیکھنا اور تمام فیوض کا مبدء اسی کو خیال کرنا۔ دوسرے اپنے تئیں اور اپنے تمام ہمجنسوں کو عاجز اور مفلس اور خدا کی مدد کا محتاج یقین کرنا یہی دو امر ہیں جن سے دعاؤں میں جوش پیدا ہوتا ہے۔ اور جوش دلانے کے لئے کامل ذریعہ ہیں۔ وجہ یہ کہ انسان کی دعائیں تب ہی جوش پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ اپنے تئیں سراسر ضعیف اور ناتوان اور مددِ الٰہی کا محتاج دیکھتا ہے اور خدا کی نسبت نہایت قوی اعتقاد سے یہ یقین رکھتا ہے کہ وہ بغایت درجہ کامل القدرت اور رب العالمین اور رحمان اور رحیم اور مالک امر مجازات ہے۔ اور جو کچھ انسانی حاجتیں ہیں سب کا پورا کرنا اسی کے ہاتھ میں ہے۔ سو سورۃ فاتحہ کے ابتدا میں جو اللہ تعالیٰ کی نسبت بیان فرمایا گیا ہے۔ کہ وہی ایک ذات ہے جو تمام محامد کاملہ سے متصف اور تمام خوبیوں کی جامع ہے۔ اور وہی ایک ذات ہے جو تمام عالموں کی رب اور تمام رحمتوں کا چشمہ اور سب کو ان کے عملوں کا بدلہ دینے والی ہے۔ پس ان صفات کے بیان کرنے سے اللہ تعالیٰ نے بخوبی ظاہر فرما دیا کہ سب قدرت اسی کے ہاتھ میں ہے

اور ہر ایک فیض اسی کی طرف سے ہے۔ اور اپنی اس قدر عظمت بیان کی کہ دنیا اور آخرت کے کاموں کا قاضی الحاجات اور ہر ایک چیز کا علت العلل اور ہر ایک فیض کا مبدء اپنی ذات کو ٹھہرایا۔ جس میں یہ بھی اشارہ فرما دیا ہے کہ اس کی ذات کے بغیر اور اس کی رحمت کے بدوں کسی زندہ کی زندگی اور آرام اور راحت ممکن نہیں۔ اور پھر بندے کو تذلل کی تعلیم دی اور فرمایا۔ ایاک نعبد وایاک نستعین اس کے یہ معنی ہیں کہ اے مبدء تمام فیوض ہم تیری ہی پرستش کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں یعنی ہم عاجز ہیں۔ آپ سے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ جب تک تیری توفیق اور تائید شامل حال نہ ہو۔ پس خدائے تعالیٰ نے دعا میں جوش دلانے کے لئے دو محرک بیان فرمائے ایک اپنی عظمت اور رحمت شاملہ دوسرے بندوں کا عاجز اور ذلیل ہونا۔ اب جاننا چاہیئے کہ یہی دو محرک ہیں جن کا دعا کے وقت خیال میں لانا دعا کرنے والوں کے لئے نہایت ضروری ہے۔ جو لوگ دعا کی کیفیت سے کسی قدر چاشنی حاصل رکھتے ہیں۔ انہیں خوب معلوم ہے کہ بغیر پیش ہونے ان دونوں محرکوں کے دعا ہو ہی نہیں سکتی۔ اور بجز ان کے آتش شوق الٰہی دعا میں اپنے شعلوں کو بلند نہیں کرتی۔ یہ بات نہایت ظاہر ہے کہ جو شخص خدا کی عظمت اور رحمت اور قدرت کاملہ کو یاد نہیں رکھتا۔ وہ کسی طرح سے خدا کی طرف رجوع نہیں کر سکتا۔ اور جو شخص اپنی عاجزی اور درماندگی اور مسکینی کا اقراری نہیں۔ اس کی روح اس مولیٰ کریم کی طرف ہرگز جھک

نہیں سکتی۔ غرض یہ ایسی صداقت ہے جس کے سمجھنے کے لئے کوئی عمیق فلسفہ درکار نہیں۔ بلکہ جب خدا کی عظمت اور اپنی ذلت اور عاجزی متحقق طور پر دل میں منقش ہو تو وہ حالت خاصہ خود انسان کو سمجھا دیتی ہے کہ خالص دعا کرنے کا یہی ذریعہ ہے۔ سچے پرستار خوب سمجھتے ہیں کہ حقیقت میں انہی دو چیزوں کا تصوّر دعا کے لئے ضروری ہے۔ یعنی اوّل اس بات کا تصوّر کہ خدائے تعالیٰ ہر ایک قسم کی ربوبیت اور پرورش اور رحمت اور بدلہ دینے پر قادر ہے۔ اور اس کی یہ صفاتِ کاملہ ہمیشہ اپنے کام میں لگی ہوئی ہیں۔ دُوسرے اس بات کا تصوّر کہ انسان بغیر توفیق اور تائید الٰہی کے کسی چیز کو حاصل نہیں کر سکتا۔ اور بلاشبہ یہ دونوں تصوّر ایسے ہیں۔ کہ جب دعا کرنے کے وقت دل میں جم جاتے ہیں تو یکایک انسان کی حالت کو ایسا تبدیل کر دیتے ہیں کہ ایک متکبر اُن سے متاثر ہو کر روتا ہوا زمین پر گر پڑتا ہے۔ اور ایک گردن کش سخت دل کے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ یہی کل ہے جس سے ایک غافل مُردے میں جان پڑ جاتی ہے۔ انہی دو باتوں کے تصوّر سے ہر ایک دل دعا کرنے کی طرف کھنچا جاتا ہے۔ غرض یہی وہ رُوحانی وسیلہ ہے جس سے انسان کی رُوح رُو بخدا ہوتی ہے۔ اور اپنی کمزوری اور امداد ربّانی پر نظر پڑتی ہے! اسی کے ذریعے سے انسان ایک ایسے عالمِ بے خودی میں پہنچ جاتا ہے جہاں اپنی مکدر ہستی کا نشان باقی نہیں رہتا۔ اور صرف ایک ذات عظمیٰ کا جلال چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور وہی ذاتِ رحمت کل اور ہر ایک ہستی کا ستون اور

ہر ایک درد کا چارہ اور ہر ایک فیض کا مبدء دکھائی دیتی ہے آخر اس سے ایک صورت فنا فی اللہ کی ظہور پذیر ہو جاتی ہے کہ جس کے ظہور سے نہ انسان مخلوق کی طرف مائل رہتا ہے نہ اپنے نفس کی طرف نہ اپنے ارادے کی طرف اور بالکل خدا کی محبت میں کھویا جاتا ہے اور اس ہستی حقیقی کی شہود سے اپنی اور دوسری مخلوق چیزوں کی ہستی کالعدم معلوم ہوتی ہے۔ اس حالت کا نام خدا نے صراط مستقیم رکھا ہے جس کی طلب کے لئے بندہ کو تعلیم فرمائی۔ اور کہا اھدنا الصراط المستقیم یعنی وہ راستہ فنا اور اور توحید اور محبت الٰہی کا جو آیات مذکورہ بالا سے مفہوم ہو رہا ہے وہ ہمیں عطا فرما اور اپنے غیر سے بکلی منقطع کر۔ خلاصہ یہ کہ خدا تعالٰے نے دعا میں جوش پیدا کرنے کے لئے وہ اسباب حقہ انسان کو عطا فرمائے۔ کہ جو اس قدر دلی جوش پیدا کرتے ہیں کہ دعا کرنے والے کو خودی کے عالم سے بے خودی اور نیستی کے عالم میں پہنچا دیتے ہیں۔ اس جگہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ بات ہرگز نہیں کہ سورہ فاتحہ دعا کے کئی طریقوں میں سے ہدایت مانگنے کا ایک طریقہ ہے۔ بلکہ جیسا کہ دلائل مذکورہ بالا سے ثابت ہو چکا ہے۔ درحقیقت صرف یہی ایک طریقہ ہے جس پر جوش دل سے دعا کا صادر ہونا موقوف ہے۔ اور جس پر طبیعت انسانی بمقتضائے اپنے فطری تقاضا کے چلنا چاہتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جیسے خدا نے دوسرے امور میں قواعد مقررہ ٹھہرا رکھے ہیں۔ ایسا ہی دعا کے لئے بھی ایک قاعدہ خاص ہے اور وہ قاعدہ وہی محرک ہیں جو سورۃ فاتحہ میں لکھے گئے ہیں

اور ممکن نہیں کہ جب تک وہ دونوں محرک کسی کے خیال میں نہ ہوں تب تک اس کی دعا میں جوش پیدا ہو سکے۔ سو طبعی راستہ دعا مانگنے کا وہی ہے۔ جو سورۃ فاتحہ میں ذکر ہو چکا ہے۔ پس سورہ ممدوحہ کے لطائف میں سے یہ ایک نہایت عمدہ لطیفہ ہے کہ دعا کو مع محرکات اس کے بیان کیا ہے۔ فتدبر

پھر ایک دُوسرا لطیفہ اس سورۃ میں یہ ہے کہ ہدایت کے قبول کرنے کے لئے پورے پورے اسباب ترغیب بیان فرمائے ہیں کیونکہ ترغیب کامل جو معقول طور پر دی جائے ایک زبردست کشش ہے۔ اور حصر عقلی کے رُو سے ترغیب کامل اس ترغیب کا نام ہے جس میں تین جُزیں موجود ہوں۔ ایک یہ کہ جس شے کی طرف ترغیب دینا منظور ہو اس کی ذاتی خوبی بیان کی جائے۔ سو اس جزو کو اس آیت میں بیان فرمایا ہے۔ اھدنا الصراط المستقیم یعنی ہم کو وہ راستہ بتلا جو اپنی ذات میں صفتِ استقامت اور راستی سے موصوف ہے۔ جس میں ذرہ کجی نہیں۔

سو اس آیت میں ذاتی خوبی اس راستے کی بیان فرما کر اس کے حصول کے لئے ترغیب دی۔ دُوسری جزو ترغیب کی یہ ہے کہ جس شے کی طرف ترغیب دینا منظور ہو اس شے کے فوائد بیان کئے جائیں۔ سو اس جزو کو اس آیت میں بیان فرمایا۔ صراط الذین انعمت علیھم یعنی اس راستے پر ہم کو چلا جس پر چلنے سے پہلے لاکھوں پر انعام اور کرم ہو چکا ہے۔ سو اس آیت میں راستہ چلنے والوں کا کامیاب ہونا ذکر فرما کر

اس راستہ کا شوق دلایا۔

تیسری جزو ترغیب کی یہ ہے کہ جس شے کی طرف ترغیب دینا منظور ہو۔ اس شے کے چھوڑنے والوں کی خرابی اور بدحالی بیان کی جائے۔ سو اس جزو کو اس آیت میں بیان فرمایا غیر المغضوب علیہم ولا الضالین یعنی ان لوگوں کی راہوں سے بچا جنہوں نے صراط مستقیم کو چھوڑا اور دوسری راہیں اختیار کیں اور غضب الٰہی میں پڑے اور گمراہ ہوئے۔ سو اس آیت میں اس سیدھا راستہ چھوڑنے پر جو ضرر مترتب ہوتا ہے اس سے آگاہ کیا غرض سورۃ فاتحہ میں ترغیب کی تینوں چیزوں کو لطیف طور پر بیان کیا ذاتی خوبی بھی بیان کی۔ فوائد بھی بیان کئے اور پھر اس راہ کے چھوڑنے والوں کی ناکامی اور بدحالی بھی بیان فرمائی۔ تا ذاتی خوبی کو سُن کر طبائع سلیمہ اس کی طرف میل کریں۔ اور فوائد پر اطلاع پا کر جو لوگ فوائد کے خواہاں ہیں ان کے دلوں میں شوق پیدا ہو اور ترک کرنے کی خرابیاں معلوم کر کے اس وبال سے ڈریں جو کہ ترک کرنے پر عائد حال ہوگا۔ پس یہ بھی ایک کامل لطیفہ ہے۔ جس کا التزام اس سورۃ میں کیا گیا۔

پھر نمبر ۱ لطیفہ اس سورۃ میں یہ ہے کہ باوجود التزام فصاحت و بلاغت کے یہ کمال دکھلایا ہے کہ محامد الٰہیہ کا ذکر کرنے کے بعد جو فقرات دعا وغیرہ کے بارے میں لکھے ہیں ان کو ایسے عمدہ طور پر بطور لف و نشر مرتب کے بیان کیا ہے۔ جس کا صفائی سے بیان کرنا باوجود رعایت تمام مدارج فصاحت و بلاغت کے بہت مشکل ہوتا ہے۔ اور جو لوگ سخن میں صاحب مذاق ہیں وہ خوب سمجھتے ہیں کہ

کہ اس قسم کے لف ونشر کیسا نازک اور دقیق کام ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے اوّل محامدِ الٰہیہ میں فیوض اربعہ کا ذکر فرمایا۔ کہ وہ رب العالمین[1] ہے۔ رحمان[2] ہے۔ رحیم[3] ہے۔ مالک[4] یوم الدین ہے۔ اور پھر بعد اس کے فقراتِ نعبد اور استعانت اور دعا اور طلب جزا کو انہیں کے ذیل میں اس لطافت سے لکھا ہے کہ جس فقرے کو کسی قسم کے فیض سے نہایت مناسبت تھی اسی کے نیچے وہ فقرہ درج کیا۔ چنانچہ رب العالمین کے مقابلہ پر ایاک نعبد لکھا۔ کیونکہ ربوبیت سے استحقاق عبادت شروع ہو جاتا ہے۔ پس اسی کے نیچے اور اسی کے محاذات میں ایاک نعبد کا لکھنا نہایت موزون اور مناسب ہے۔ اور رحمان کے مقابلے پر ایاک نستعین لکھا۔ کیونکہ بندے کیلئے اعانت الٰہی جو توفیق عبادت اور ہر ایک اس کے مطلب میں ہوتی ہے۔ جس پر اس کی دنیا اور آخرت کی صلاحیت موقوف ہے۔ یہ اس کے کسی عمل کا پاداش نہیں بلکہ محض صفتِ رحمانیت کا اثر ہے۔ پس استعانت کو صفتِ رحمانیت سے بشدت مناسبت ہے۔ اور رحیم کے مقابلے پر اھدنا الصراط المستقیم لکھا۔ کیونکہ دعا ایک مجاہدہ اور کوشش ہے۔ اور کوششوں پر جو ثمرہ مترتب ہوتا ہے وہ صفت رحیمیت کا اثر ہے۔ اور مالک یوم الدین کے مقابلے پر صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین لکھا کیونکہ امر مجازات مالک یوم الدین کے متعلق ہے۔ سو ایسا فقرہ جس میں طلب انعام اور عذاب سے بچنے کی درخواست ہے اسی کے نیچے رکھنا موزون ہے ۔

چوتھا لطیفہ یہ ہے کہ سورۃ فاتحہ مجمل طور پر تمام مقاصد قرآن شریف پر مشتمل ہے۔ گویا یہ سورہ مقاصد قرآنیہ کا ایک اعجاز لطیف ہے۔ اسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔ آیتہ اِنا آتیناک سبعاً من المثانی والقرآن العظیم یعنی ہم نے تجھے اے رسول سات آئتیں سورہ فاتحہ کی عطا کی ہیں۔ جو مجمل طور پر تمام مقاصد قرآنیہ پر مشتمل ہیں۔ اور ان کے مقابلے پر قرآن عظیم بھی عطا فرمایا ہے جو مفصل طور پر مقاصد دینیہ کو ظاہر کرتا ہے۔ اور اسی جہت سے اس سورۃ کا نام اُم الکتاب اور سورۃ الجامع ہے۔ اُم الکتاب اس جہت سے کہ جمیع مقاصد قرآنیہ اُس سے مستخرج ہوتے ہیں۔ اور سورۃ الجامع اس جہت سے کہ علوم قرآنیہ کے جمیع انواع پر بصورت اجمالی مشتمل ہے اسی جہت سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے کہ جس نے سورۃ فاتحہ کو پڑھا۔ گویا اس نے سارے قرآن کو پڑھ لیا۔ غرض قرآن شریف اور حدیث نبوی سے ثابت ہے کہ سورۃ فاتحہ ممدوحہ ایک آئینہ قرآن نما ہے۔ اس کی تصریح یہ ہے کہ قرآن شریف کے مقاصد میں سے ایک یہ ہے کہ وہ تمام محامد کاملہ باری تعالیٰ کو بیان کرتا ہے اور اس کی ذات کے لئے جو کمال تام حاصل ہے اس کو بوضاحت بیان فرماتا ہے۔ سو یہ مقصد الحمد للہ میں بطور اجمال آ گیا۔ کیونکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ تمام محامد کاملہ اللہ کے لئے ثابت ہیں۔ جو مستجمع جمیع کمالات اور مستحق جمیع عبادات ہے۔

دوسرا مقصد قرآن شریف کا یہ ہے کہ وہ خدا کا صانع کامل ہونا اور

خالق العالمین ہونا ظاہر کرتا ہے اور عالم کے ابتدا کا حال بیان فرماتا ہے اور جو دائرہ عالم میں داخل ہو چکا ہے اس کو مخلوق ٹھہراتا ہے۔ اور ان امور کے جو لوگ مخالف ہیں ان کا کذب ثابت کرتا ہے سو یہ مقصد رب العالمین میں بطور اجمال آ گیا۔

تیسرا مقصد قرآن شریف کا خدا کا فیضان بلا استحقاق ثابت کرنا اور اس کی رحمتِ عامہ کا بیان کرنا ہے۔ سو یہ مقصد لفظ رحمان میں بطور اجمال آ گیا۔

چوتھا مقصد قرآن شریف کا خدا کا وہ فیضان ثابت کرنا ہے۔ جو محنت اور کوشش پر مترتب ہوتا ہے سو یہ مقصد لفظ رحیم میں آ گیا۔

پانچواں مقصد قرآن شریف کا عالم معاد کی حقیقت بیان کرنا ہے۔ سو یہ مقصد مالک یوم الدین میں آ گیا۔

چھٹا مقصد قرآن شریف کا اخلاص اور عبودیت اور تزکیہ نفس عن غیر اللہ اور علاج امراض روحانی اور اصلاح اخلاق ردّیہ اور توحید فی العبادت کا بیان کرنا ہے۔ سو یہ مقصد ایاک نعبد میں بطور اجمال آ گیا۔

ساتواں مقصد قرآن شریف کا ہر ایک کام میں فاعل حقیقی خدا کو ٹھہرانا اور تمام توفیق اور لطف اور نصرت اور ثبات علی الطاعت اور عصمت عن العصیان اور حصول جمیع اسباب خیر اور صلاحیت دنیا و دین اسی کی طرف سے قرار دینا اور ان تمام امور میں اسی سے مدد چاہنے کے لئے تاکید کرنا سو یہ مقصد ایاک نستعین میں بطور اجمال آ گیا۔

آٹھواں مقصد قرآن شریف کا صراط مستقیم کے دقائق کو بیان کرنا ہے

اور پھر اس کی طلب کے لئے تاکید کرنا کہ دعا اور تضرع سے اس کو طلب کریں سو یہ مقصد اھدنا الصراط المستقیم میں بطور اجمال کے آگیا۔

نواں مقصد قرآن شریف کا ان لوگوں کا طریق و خلق بیان کرنا ہے۔ جن پر خدا کا انعام و فضل ہوا تا کہ طالبین حق کے دل جمعیت پکڑیں۔ سو یہ مقصد صراط الذین انعمت علیھم میں آگیا۔

دسواں مقصد قرآن شریف کا ان لوگوں کا خلق و طریق بیان کرنا ہے جن پر خدا کا غضب ہوا۔ یا جو راستہ بھول کر انواع و اقسام کی بدعتوں میں پڑ گئے۔ تا حق کے طالب ان کی راہوں سے ڈریں سو یہ مقصد غیر المغضوب علیھم ولا الضالین میں بطور اجمال آگیا ہے۔

یہ مقاصد عشرہ ہیں جو قرآن شریف میں مندرج ہیں جو تمام صداقتوں کا اصل الاصول ہیں۔ سو یہ تمام مقاصد سورۃ فاتحہ میں بطور اجمال آ گئے۔

پانچواں لطیفہ سورہ فاتحہ میں یہ ہے کہ وہ اس اتم اور اکمل تعلیم پر مشتمل ہے کہ جو طالب حق کے لئے ضروری ہے اور جو ترقیات قربت اور معرفت کے لئے کامل دستور العمل ہے۔ کیونکہ ترقیاتِ قربت کا شروع اس نقطہ سیر سے ہے کہ جب سالک اپنے نفس پر ایک موت قبول کر کے اور سختی اور آزار کشی کو روا رکھ کر ان تمام نفسانی خواہشوں سے خالصتاً للہ دست کش ہو جائے کہ جو اس میں اور اس کے مولیٰ کریم میں جدائی ڈالتے ہیں اور اس کے منہ کو خدا کی طرف سے پھیر کر اپنی نفسانی لذات اور جذبات اور حالات اور خیالات اور ارادات اور نیز مخلوق کی طرف پھیرتے ہیں۔ اور ان کے خوفوں اور

امیدوں میں گرفتار کرتے ہیں۔ اور ترقیات کا اوسط درجہ وہ ہے کہ جو جو ابتدائی درجہ میں نفس کشی کے لئے تکالیف اٹھائی جاتی ہیں۔ اور حالت معتادہ کو چھوڑ کر طرح طرح کے دکھ سہنے پڑتے ہیں۔ وہ سب آلام صورت انعام میں ظاہر ہو جائیں۔ اور بجائے مشقت کے لذت اور بجائے رنج کے راحت اور بجائے تنگی کے انشراح اور بشاشت نمودار ہو اور ترقیات کا اعلیٰ درجہ وہ ہے کہ سالک اس قدر خدا اور اس کے ارادوں اور خواہشوں سے اتحاد اور محبت اور یک جہتی پیدا کرلے کہ اس کا تمام اپنا عین و اثر جاتا رہے اور ذات اور صفات الٰہیہ بلا شائبہ علت اور بلا توہم حالیت و محلیت اس کے وجود آئینہ صفت میں منعکس ہو جائیں۔ اور فنا اتم کے آئینہ کے ذریعہ سے جس نے سالک میں اور اس کی نفسانی خواہشوں میں غایت درجہ کا بعد ڈال دیا ہے۔ انعکاس ربانی ذات اور صفات کا نہایت صفائی سے دکھائی دے۔ اس تقریر میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جس میں وجودیوں یا ویدانتیوں کے باطل خیال کی تائید ہو۔ کیونکہ انہوں نے خالق اور مخلوق میں جو ابدی امتیاز ہے شناخت نہیں کیا۔ اور اپنے کشوف مشتبہ کے دھوکہ سے کہ جو سلوک ناتمام کی حالت میں اکثر پیش آجاتے ہیں۔ یا جو سودا انگیز ریاضتوں کا ایک نتیجہ ہوتا ہے سخت مغالطات کے پیچ میں پڑ گئے یا کسی نے سکر اور بے خودی کی حالت میں جو ایک قسم کا جنون ہے۔ اس فرق کو نظر سے ساقط کر دیا۔ کہ جو خدا کی روح اور انسان کی روح میں باعتبار طاقتوں اور قوتوں اور کمالات اور تقدسات کے ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ قادر مطلق کہ جس کے علم قدیم

سے ایک ذرہ مخفی نہیں اور جس کی طرف کوئی نقصان اور خسران عاید نہیں ہو سکتا۔ اور جو ہر ایک قسم کے جہل اور آلودگی اور ناتوانی اور غم اور حزن اور درد اور رنج اور گرفتاری سے پاک ہے۔ وہ کیونکر اس چیز کا عین ہو سکتا ہے۔ کہ جو ان سب بلاؤں میں مبتلا ہے۔ کیا انسان جس کی روحانی ترقیات کے لئے اس قدر حالات منتظرہ ہیں جن کا کوئی کنارہ نظر نہیں آتا وہ اس ذات صاحب کمال تام سے مشابہ یا اس کا عین ہو سکتا ہے۔ جس کے لئے کوئی حالت منتظرہ باقی نہیں؟ کیا جس کی ہستی فانی اور جس کی رُوح میں صریح مخلوقیت کے نقصان پائے جاتے ہیں وہ باوجود اپنی تمام آلائشوں اور کمزوریوں اور ناپاکیوں اور عیبوں اور نقصانوں کے اس ذات جلیل الصفات سے برابر ہو سکتا ہے۔ جو اپنی خوبیوں اور پاک صفتوں میں ازلی ابدی طور پر اتم اور اکمل ہے۔ سبحانہ وتعالیٰ عما یصفون۔

بلکہ اس تیسری قسم کی ترقی سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ سالک خدا کی محبت میں ایسا فانی اور مستہلک ہو جاتا ہے۔ اور اس قدر ذات بیچون و بیچگون اپنی تمام کاملہ کے ساتھ اس سے قریب ہو جاتی ہے کہ الوہیت کے تجلیات اس کے نفسانی جذبات پر ایسے غالب آجاتے ہیں اور ایسے اس کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ جو اس کو اپنے نفسانی جذبات سے بلکہ ہر ایک سے جو نفسانی جذبات کا تابع ہو مغائرت کلی اور عداوت ذاتی پیدا ہو جاتی ہے اور اس میں اور قسم دوئم کی ترقی میں فرق یہ ہے کہ گو قسم دوئم میں بھی اپنے رب کی مرضی سے موافقت تامہ پیدا ہو جاتی ہے اور اس کا ایلام

بصورت انعام نظر آتا ہے مگر ہنوز اس میں ایسا تعلق باللہ نہیں ہوتا کہ جو ماسوائے اللہ کے ساتھ عداوتِ ذاتی پیدا ہو جانے کا موجب ہوا ور جس سے محبتِ الٰہی صرف دل کا مقصد ہی نہ رہے بلکہ دل کی سرشت بھی ہو جائے۔ غرض قسم دوم کی ترقی میں خدا سے موافقتِ تامہ کرنا اور اس کے غیر سے عداوت رکھنا سالک کا مقصد ہوتا ہے۔ اور اس مقصد کے حصول سے وہ لذت پاتا ہے۔ لیکن قسم سوم کی ترقی میں خدا سے موافقتِ تامہ اور اس کے غیر سے عداوت خود سالک کی سرشت ہو جاتی ہے جس سرشت کو وہ کسی حالت میں چھوڑ نہیں سکتا۔ کیونکہ انفکاک الشئے عن نفسہٖ محال ہے۔ برخلاف قسم دوم کے کہ اس میں انفکاک جائز ہے اور جب تک ولایت کسی ولی کی قسم سوم تک نہیں پہنچتی۔ عارضی ہے اور خطرات سے امن میں نہیں۔ وجہ یہ کہ جب تک انسان کی سرشت میں خدا کی محبت اور اس کے غیر کی عداوت داخل نہیں تب تک کچھ رگ و ریشہ ظلم کا اس میں باقی ہے۔ کیونکہ اُس نے عبودیت کو جیسا کہ چاہیئے تھا ادا نہیں کیا اور لقائے تام حاصل کرنے سے ہنوز قاصر ہے لیکن جب اس کی سرشت میں محبتِ الٰہی اور موافقت باللہ بخوبی داخل ہو گئی یہاں تک کہ خدا اس کے کان ہو گیا جن سے وہ سنتا ہے۔ اور اس کی آنکھیں ہو گیا جن سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ ہو گیا جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں ہو گیا۔ جس سے وہ چلتا ہے تو پھر کوئی ظلم اس میں باقی نہ رہا۔ اور ہر ایک خطرے سے امن میں آ گیا۔ اسی درجے کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے

الذین آمنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم اولئک لھم الامن و

ھم مھتدون -

اب سمجھنا چاہئیے کہ یہ ترقیات ثلاثہ کہ جو تمام علوم و معارف کا اصل الاصول بلکہ تمام دین کا لب لباب ہے۔ سورہ فاتحہ میں بتمام تر خوبی و رعایت ایجاز و خوش اسلوبی بیان کئے گئے ہیں۔ چنانچہ پہلی ترقی کہ جو قربت کے میدانوں میں چلنے کے لئے اول قدم ہے اس آیت میں تعلیم کی گئی ہے جو فرمایا اھدنا الصراط المستقیم کیونکہ ہر ایک قسم کی کجی اور بے راہی سے باز آکر اور بالکل رو بخدا ہو کر راہ راست کو اختیار کرنا یہ وہی سخت گھاٹی ہے جس کو دوسرے لفظوں میں فنا سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ امور مالوفہ اور معتادہ کو یک لخت چھوڑ دینا اور نفسانی خواہشوں کو جو ایک عمر سے عادت ہو چکی ہے یک دفعہ ترک کرنا اور ہر ایک ننگ اور ناموس اور عجب اور ریا سے منہ پھیر کر اور تمام ماسوے اللہ کو کالعدم سمجھ کر سیدھا خدا کی طرف رُخ کر لینا حقیقت میں ایک ایسا کام ہے جو موت کے برابر ہے۔ اور یہ موت رُوحانی پیدائش کا مدار ہے۔ اور جیسے دانہ جب تک خاک میں نہیں ملتا اور اپنی صورت کو نہیں چھوڑتا تب تک نیا دانہ وجود میں آنا غیر ممکن ہے۔ اسی طرح روحانی پیدائش کا جسم اس فنا سے طیار ہوتا ہے۔ جوں جوں بندے کا نفس شکست پکڑتا جاتا ہے اور اس کا فعل اور ارادت اور رو بخلوق ہونا فنا ہوتا جاتا ہے۔ توں توں پیدائش رُوحانی کے اعضاء بنتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب فنا اتم حاصل ہو جاتی ہے تو وجودِ ثانی کی خلعت عطا کی جاتی ہے اور ثم انشانا ہ خلقاً آخر کا وقت آجاتا ہے اور چونکہ یہ فنا اتم بغیر نصرت و توفیق و توجہ خاص قادر مطلق کے ممکن نہیں۔ اس لئے

یہ دعا تعلیم کی یعنی اھدنا الصراط المستقیم جس کے یہ معنی ہیں کہ اے خدا ہم کو راہ راست پر قائم کر اور ہر ایک طور کی کجی اور بے راہی سے نجات بخش۔ اور یہ کامل استقامت اور راہِ راست روی جس کو طلب کرنے کا حکم ہے نہایت سخت کام ہے اور اوّل دفعہ میں اس کا حملہ سالک پر ایک شیر ببر کی طرح ہے جس کے سامنے موت نظر آتی ہے پس اگر سالک ٹھہر گیا اور اس موت کو قبول کر لیا تو پھر بعد اس کے کوئی ایسی سخت موت نہیں۔ اور خدا اس سے زیادہ تر کریم ہے کہ پھر اس کو یہ جلتا ہوا دوزخ دکھاوے۔ غرض یہ کامل استقامت وہ فنا ہے کہ جس سے کارخانہ وجود بندہ کو بکلی شکست پہنچتی ہے اور ہوا اور شہوت اور ارادت اور ہر ایک خود روی کے فعل سے بیکبارگی دست کشی ہو جاتی ہے اور یہ مرتبہ سیر و سلوک کے مراتب میں سے وہ مرتبہ ہے جس میں انسانی کوششوں کو بہت کچھ دخل ہے۔ اور بشری مجاہدات کی بخوبی پیش رفت ہے اور اسی حد تک اولیاء اللہ کی کوششیں اور سالکین کی محنتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اور پھر بعد اس کے خاص مواہب سماوی ہیں جن میں بشری کوششوں کو کچھ دخل نہیں بلکہ خود خدائے تعالیٰ کی طرف سے عجائبات سماوی کی سیر کرانے کے لئے غیبی سواری اور آسمانی براق عطا ہوتا ہے۔

اور دوسری ترقی کہ جو قربت کے میدانوں میں چلنے کے لئے دوسرا قدم ہے اس آیت میں تعلیم کی گئی ہے جو فرمایا ہے صراط الذین انعمت علیہم یعنی ہم کو ان لوگوں کا راہ دکھلا جن پر تیرا انعام اکرام ہے۔ اس جگہ واضح رہے کہ جو لوگ منعم علیہم ہیں اور خدا سے ظاہری و باطنی نعمتیں پاتے ہیں۔ شدائد سے خالی نہیں ہیں بلکہ اس دار الابتلا میں ایسی شدتیں اور صعوبتیں ان کو پہنچتی ہیں کہ اگر

وہ کسی دُوسرے کو پہنچتیں تو مدد ایمانی اس کی منقطع ہو جاتی۔ لیکن اس جہت
سے ان کا نام منعم علیہم رکھا گیا ہے کہ وہ بباعث غلبہ محبت آلام کو برنگ
انعام دیکھتے ہیں۔ اور ہر ایک رنج یا راحت جو دوست حقیقی کی طرف سے
ان کو پہنچتی ہے بوجہ مستی عشق اس سے لذت اُٹھاتے ہیں۔ پس یہ ترقی فی القرب
کی دُوسری قسم ہے جس میں اپنے محبوب کے جمیع افعال سے لذت آتی ہے
اور جو کچھ اُس کی طرف سے پہنچے انعام ہی انعام نظر آتا ہے۔ اور اصل موجب
اس حالت کا ایک محبت کامل اور تعلق صادق ہوتا ہے جو اپنے محبوب سے ہو
جاتا ہے۔ اور یہ ایک موہبت خاص ہوتی ہے جس میں حیلہ اور تدبیر کو کچھ دخل
نہیں۔ بلکہ خدا ہی کی طرف سے آتی ہے اور جب آتی ہے تو پھر سالک ایک دوسرا
رنگ پکڑ لیتا ہے۔ اور تمام بوجھ اس کے سر سے اُتارے جاتے ہیں اور ہر ایک ایلام
انعام ہی معلوم ہوتا ہے اور شکوہ و شکایت کا نشان نہیں ہوتا۔ پس یہ ثبت الٰہی ذٰ
ہے کہ گویا انسان بعد موت کے زندہ کیا گیا ہے کیونکہ ان تلخیوں سے بکلی
نکل آتا ہے۔ جو پہلے درجے میں تھیں۔ جن سے ہر ایک وقت موت کا سامنا معلوم
ہوتا تھا مگر اب چاروں طرف سے انعام ہی انعام پاتا ہے اور اسی جہت سے
اس کی حالت کے مناسب حال یہی تھا کہ اُس کا نام منعم علیہ رکھا جاتا۔ اور
دُوسرے لفظوں میں اس حالت کا نام بقا ہے۔ کیونکہ سالک اس حالت میں
اپنے تئیں ایسا پاتا ہے کہ گویا وہ مرا ہوا تھا۔ اور اب زندہ ہو گیا اور اپنے نفس
میں بڑی خوشحالی اور انشراح صدر دیکھتا ہے اور بشریت کے انقباض سب
دور ہو جاتے ہیں۔ اور الوہیت کے مربیانہ انوار نعمت کا دروازہ کھولا جاتا ہے

اور عنایات الٰہیہ کامل طور پر متوجہ ہوتی ہیں۔ اور اس مرتبے کا نام سیر فی اللہ ہے کیونکہ اس مرتبے میں ربوبیت کے عجائبات سالک پر کھولے جاتے ہیں۔ اور جو ربانی نعمتیں دوسروں سے مخفی ہیں ان کو اِن کا سیر کرایا جاتا ہے۔ کشوفِ صادقہ سے متمتع ہوتا ہے۔ اور مخاطبات حضرت احدیت سے سرفرازی پاتا ہے اور عالم ثانی کے باریک بھیدوں سے مطلع کیا جاتا ہے اور علوم اور معارف سے وافر حصہ دیا جاتا ہے۔ غرض ظاہری و باطنی نعمتوں سے بہت کچھ اس کو عطا کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس درجہ یقین کامل تک پہنچتا ہے کہ گویا مدبر حقیقی کو بچشم خود دیکھتا ہے۔ سو اس طور کی اطلاع کامل جو اسرار سماوی ہیں اس کو بخشے جاتے ہیں۔ اس کا نام سیر فی اللہ ہے لیکن یہ وہ مرتبہ ہے جس میں محبت الٰہی انسان کو دی جاتی ہے لیکن بطریق طبعیت اس میں قائم نہیں کی جاتی۔ یعنی اس کی سرشت میں داخل نہیں ہوتی۔ بلکہ اس میں محفوظ ہوتی ہے۔

اور تیسری ترقی جو قربت کے میدانوں میں چلنے کے لئے انتہائی قدم ہے۔ اس آیت میں تعلیم کی گئی ہے۔ جو فرمایا ہے۔ غیر المغضوب علیہم ولا الضالین یہ وہ مرتبہ ہے جس میں انسان کو خدا کی محبت اور اس کے غیر کی عداوت سرشت میں داخل ہو جاتی ہے اور بطریق طبعیت اس میں قیام پکڑتی ہے اور صاحب اس مرتبے کا اخلاق الٰہیہ سے ایسا ہی بالطبع پیار کرتا ہے کہ جیسے وہ اخلاق حضرت احدیت میں محبوب ہیں۔ اور محبت ذاتی حضرت خداوند کریم کی اس قدر اس کے دل

میں آمیزش کر جاتی ہے۔ کہ اس کے دل سے محبت الٰہی کا منفک ہونا مستحیل اور ممتنع ہوتا ہے۔ اور اگر اس کے دل کو اور اس کی جان کو بڑے بڑے امتحانوں اور ابتلاؤں کے سخت صدمات کے پیچ میں دے کر کوفتہ کیا جائے اور نچوڑا جائے تو بجز محبت الٰہیہ کے اور کچھ اس کے دل اور جان سے نہیں نکلتا اسی کے درد سے لذت پاتا ہے۔ اور اسی کو واقعی اور حقیقی طور پر اپنا دلارام سمجھتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جس میں تمام ترقیات قرب ختم ہو جاتی ہیں۔ اور انسان اپنے اس انتہائی کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ کہ جو فطرت بشری کیلئے مقدر ہے۔

یہ لطائف خمسہ ہیں کہ جو بطور نمونہ مشتے از خروارے ہم نے لکھے ہیں۔ مگر عجائبات معنوی اس سورۃ میں اور نیز دوسرے حقائق و معارف اس قدر ہیں کہ اگر ان کا عشر عشیر بھی لکھا جائے تو اس کے لکھنے کے لئے ایک بڑی کتاب چاہیئے۔ اور جو اس سورۃ مبارکہ میں خواص روحانی ہیں وہ بھی ایسے اعلیٰ اور حیرت انگیز ہیں جن کو طالب حق دیکھ کر اس بات کے اقرار کے لئے مجبور ہوتا ہے کہ بلاشبہ وہ قادر مطلق کا کلام ہے۔ چنانچہ منجملہ اس خواص عالیہ کے ایک خاصہ رُوحانی سورۃ فاتحہ میں یہ ہے کہ دلی حضور سے اپنی نماز میں اس کو ورد کر لینا اور اس کی تعلیم کو فی الحقیقت سچ سمجھ کر اپنے دل میں قائم کر لینا تنویر باطن میں نہایت دخل رکھتا ہے۔ یعنی اس سے انشراح خاطر ہوتا ہے۔ اور بشریت کی ظلمت دُور ہوتی ہے۔ اور حضرت مبدء فیوض کے فیوض انسان پر وارد ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ اور قبولیت الٰہی کے انوار

اس پر احاطہ کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ترقی کرتا کرتا مخاطباتِ الٰہیہ سے سرفراز ہو جاتا ہے۔ اور کشوفِ صادقہ اور الہاماتِ واضحہ سے تمتّع تام حاصل کرتا ہے اور حضرت الوہیت کے مقربین میں دخل پا لیتا ہے اور وہ وہ عجائبات القائے غیبی اور کلام لاریبی اور استجابتِ ادعیہ اور کشف مغیبات اور تائید حضرت قاضی الحاجات اس سے ظہور میں آتی ہیں کہ جس کی نظیر اس کے غیر میں نہیں پائی جاتی۔ اگر مخالفین اس سے انکار کریں اور غالباً انکار ہی کریں گے تو اس کا ثبوت اس کتاب میں دیا گیا ہے۔ اور یہ احقر ہر ایک طالب حق کی تسلّی کرنے کو طیار ہے۔ اور نہ صرف مخالفین کو بلکہ اسمی اور رسمی موافقین کو بھی کہ جو بظاہر مسلمان ہیں۔ مگر محجوب مسلمان اور قالب بے جان ہیں جن کو اس پُر ظلمت زمانہ میں آیاتِ سماویہ پر یقین نہیں رہا۔ اور الہامات حضرتِ احدیت کو محال خیال کرتے ہیں۔ اور از قبیل اوہام اور وساوس قرار دیتے ہیں۔ جنہوں نے انسان کی ترقیات کا نہایت تنگ اور منقبض دائرہ بنا رکھا ہے۔ کہ جو صرف عقلی اٹکلوں اور قیاسی ڈھکوسلوں پر ختم ہوتا ہے۔ اور دوسری طرف خدائے تعالیٰ کو بھی نہایت درجہ کا کمزور اور ضعیف سا خیال کر رہے ہیں۔ سو یہ عاجز ان سب صاحبوں کی خدمت میں باادب تمام عرض کرتا ہے کہ اگر اب تک تاثیرات قرآنی سے انکار ہے اور اپنے جہل قدیم پر اصرار ہے تو اب نہایت نیک موقعہ ہے کہ یہ احقر خادم دین اپنے ذاتی تجارب سے ہر ایک منکر کی پوری پوری اطمینان کر سکتا ہے، اس لئے مناسب ہے کہ طالب حق بن کر اس احقر کی طرف رجوع کریں۔ اور جو جو خواص کلام

الٰہی کے اوپر ذکر کئے گئے ہیں ان کو بچشم خود دیکھ لیں۔ اور تاریکی اور ظلمت میں سے نکل کر نور حقیقی میں داخل ہو جائیں۔ اب تک تو یہ عاجز زندہ ہے۔ مگر وجودِ خاکی کی کیا بنیاد اور جسمِ فانی کا کیا اعتماد۔ پس مناسب ہے کہ اس عام اعلان کو سنتے ہی احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی طرف توجہ کریں۔ تا اگر دعویٰ اس احقر کا یہ پایۂ ثبوت نہ پہنچ سکے تو منکر اور روگردان رہنے کے لئے ایک وجہ موجہ پیدا ہو جائے۔ لیکن اگر اس عاجز کے قول کی صداقت جیسا کہ چاہیئے پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے تو خدا سے ڈر کر اپنے باطل خیالات سے باز آئیں اور طریقہ حقہ اسلام پر قدم جما دیں تا اس جہان میں ذلت اور رسوائی اور دوسرے جہان میں عذاب اور عقوبت سے نجات پا دیں۔

سو دیکھو اے بھائیو! اے عزیزو! اے فلاسفرو! اے پنڈتو! اے پادریو! اے آریو! اے نیچریو! اے براہمو دھرم والو!! میں اس وقت صاف صاف اور علانیہ کہہ رہا ہوں کہ اگر کسی کو شک ہو اور خاصہ مذکورہ بالا کے ماننے میں کچھ تامل ہو تو وہ بلا توقف اس عاجز کی طرف صبوری اور صدقِ دلی سے کچھ عرصے تک صحبت میں رہ کر بیانات مذکورہ بالا کی حقیقت کو بچشم خود دیکھ لے۔ ایسا نہ ہو کہ اس ناچیز کے گذرنے کے بعد کوئی نامنصف کہے کہ کب مجھ کو کھول کر کہا گیا کہ تا میں اس جستجو میں پڑتا۔ کب کسی نے اپنی ذمہ داری سے دعویٰ کیا تا میں ایسے دعوے کا ثبوت اس سے مانگتا۔ سو اے بھائیو! اے حق کے طالبو! ادھر دیکھو کہ یہ عاجز کھول کر کہتا ہے اور اپنے خدا پر توکل کر کے جس کے انوار دن رات دیکھ رہا ہے، اس بات کا ذمہ دار بنتا ہے کہ

اگر تم دلی صدق اور صفائی سے حق کے جویاں اور خواہاں ہوکر صبر اور ارادت سے کچھ مدت تک اس احقر کی صحبت میں زندگی بسر کرو گے تو یہ بات تم پر بدیہی طور پر کھل جائے گی کہ فی الحقیقت وہ خواص روحانی جن کا اس جگہ ذکر کیا گیا ہے سورہ فاتحہ اور قرآن شریف میں پائے جاتے ہیں۔ سو کیا مبارک وہ شخص ہے کہ جو اپنے دل کو تعصب اور عناد سے خالی کر کے اور اسلام کے قبول کرنے پر مستعد ہو کر اس مطلب کے حصول کے لئے بصدق و ارادت توجہ کرے اور کیا بد قسمت وہ آدمی ہے کہ اس قدر وانشگاف باتیں سن کر پھر بھی نظر اٹھا کر نہ دیکھے۔ اور دیدہ دانستہ خدا تعالیٰ کی لعنت اور غضب کا مورد بن جائے۔ مرگ نہایت نزدیک ہے اور بازی اجل سر پر ہے اگر جلد تر خدا سے ڈر کر اس عاجز کی باتوں کی طرف نظر نہیں کرو گے۔ اور اپنی تسلی اور تشفی حاصل کرنے کے لئے صدق اور ارادت سے قدم نہیں اٹھاؤ گے۔ تو میں ڈرتا ہوں کہ آپ لوگوں کا ایسا ہی انجام نہ ہو۔ جیسا پنڈت دیانند آریوں کے سرگروہ کا انجام ہوا۔ کیونکہ اس احقر نے تکوان کی وفات سے ایک مدت پہلے راہ راست کی طرف دعوت کی اور آخرت کی رسوائی یاد دلائی اور ان کے مذہب اور اعتقاد کا سراسر باطل ہونا براہین قطعیہ سے ان پر ظاہر کیا اور نہایت عمدہ اور کامل دلائل سے بادب تمام ان پر ثابت کر دیا۔ کہ دہریوں کے بعد تمام دنیا میں آریوں سے بدتر اور کوئی مذہب نہیں کیونکہ یہ لوگ خدائے تعالےٰ کی سخت درجے پر تحقیر کرتے ہیں کہ اس کو خالق اور رب العالمین نہیں سمجھتے اور تمام عالم کو یہاں تک کہ دنیا کے ذرہ ذرہ کو اس کا شریک ٹھہراتے ہیں

اور صفتِ قدامت اور ہستی حقیقی میں اس کے برابر سمجھتے ہیں۔ اگر ان کو کہو کہ کیا تمہارا پرمیشر رُوح پیدا کر سکتا ہے۔ یا کوئی ذرہ جسم کا وجود میں لا سکتا ہے یا ایسا ہی کوئی اور زمین و آسمان بھی بنا سکتا ہے یا کسی اپنے عاشق صادق کو نجات ابدی دے سکتا ہے اور بار بار کتا بلا بننے سے بچا سکتا ہے۔ یا اپنے کسی محبِ خاص کی توبہ قبول کر سکتا ہے۔ تو ان سب باتوں کا یہی جواب ہے کہ ہرگز نہیں اس کو یہ قدرت ہی نہیں کہ ایک ذرہ اپنی طرف سے پیدا کر سکے۔ اور نہ اس میں یہ رحیمیت ہے کہ کسی اوتار یا کسی رکھی یا منی کو یا کسی ایسے کو بھی کہ جن پر وید اُترا ہو ہمیشہ کے لئے نجات دے۔ اور پھر اس کا مرتبہ ملحوظ رکھ کر مکتی خانہ سے باہر دفع نہ کرے۔ اور اپنے اس پیارے کو جس کے دل میں پرمیشر کی پریت اور محبّت رچ گئی ہے۔ بار بار کتا بلا بننے سے بچاوے۔

مگر افسوس کہ پنڈت صاحب نے اس نہایت ذلیل اعتقاد سے دست کشی اختیار نہ کی اور اپنے تمام بزرگوں اور اوتاروں وغیرہ کی اہانت اور ذلّت جائز رکھی۔ مگر اس ناپاک اعتقاد کو نہ چھوڑا اور مرتے دم تک یہی ان کو ظن رہا کہ گو کیسا ہی اوتار ہو رام چندر ہو یا کرشن ہو یا خود ہی رشی ہو جس پر وید اُترا ہے۔ پرمیشر کو ہرگز منظور ہی نہیں کہ اس پر دائمی فضل کرے بلکہ وہ اوتار بنا کر پھر بھی انہیں کو کیڑے مکوڑے ہی بناتا رہے گا۔ وہ کچھ ایسا سخت دل ہے کہ عشق اور محبت کا اس کو ذرا پاس نہیں اور ایسا ضعیف ہے کہ اس میں خود بخود بنانے کی ذرہ طاقت نہیں۔ یہ پنڈت صاحب کا خوش

عقیدہ تھا جس کو پُر زور دلائل سے رد کر کے پنڈت صاحبؔ یہ ثابت کیا گیا تھا کہ خدائے تعالیٰ ہرگز ادھورا اور ناقص نہیں بلکہ مبدا ہے تمام فیضوں کا اور جامع ہے تمام خوبیوں کا اور مستجمع ہے جمیع صفات کاملہ کا اور واحد لاشریک ہے۔ اپنی ذات میں اور صفات میں اور معبودیت میں اور پھر اس کے بعد دو دفعہ بذریعہ خط رجسٹری شدہ حقیت دین اسلام سے بدلائل واضحہ ان کو متنبہ کیا گیا۔ اور دُوسرے خط میں یہ بھی لکھا گیا۔ کہ اسلام وہ دین ہے جو اپنی حقیت پر دوہرا ثبوت ہر وقت موجود رکھتا ہے ایک معقول دلائل جن سے اصول حقہ اسلام کی دیوار روئیں کی طرح مضبوط اور مستحکم ثابت ہوتی ہے۔ دُوسری آسمانی آیات و ربانی تائیدات اور غیبی مکاشفات اور رحمانی الہامات و مخاطبات اور دیگر خوارق عادات جو اسلام کے کامل متبعین سے ظہور میں آتے ہیں۔ جن سے حقیقی نجات اسی جہان میں سچے ایمان دار کو ملتی ہے۔ یہ دونوں قسم کے ثبوت اسلام کے غیر میں ہرگز نہیں پائے جاتے۔ اور نہ ان کو طاقت ہے کہ اس کے مقابلے پر کچھ دم مار سکیں۔ لیکن اسلام میں وجود اس کا متحقق ہے۔ سو اگر ان دونوں قسم کے ثبوت میں سے کسی قسم کے ثبوت میں شک ہو تو اسی جگہ قادیان میں آکر اپنی تسلّی کر لینی چاہیئے۔

اور یہ بھی پنڈت صاحب کو لکھا گیا کہ معمولی خرچ آپ کی آمد و رفت کا اور نیز واجبی خرچ خوراک کا ہمارے ذمہ رہے گا اور وہ خط ان کے بعض آریوں کو بھی دکھلایا گیا۔ اور دونوں رجسٹریوں کی ان کی دستخطی رسید

بھی آگئی - پھر انہوں نے دُنیا اور ناموس دنیوی کے باعث سے
اس طرف ذرہ بھی توجہ نہ کی - یہاں تک کہ جس دنیا سے انہوں نے پیار
کیا اور ربط بڑھایا - آخر بعد حسرت اس کو چھوڑ کر اور تمام درم و دینار
سے بمجبوری جدا ہو کر اس دار الفناء سے کوچ کر گئے اور بہت سی
غفلت اور ظلمت اور کفر کے پہاڑ اپنے سر پر لے گئے اور ان کے سفر
آخرت کی خبر بھی کہ جو ان کو نیس اکتوبر ۱۸۸۳ء میں پیش آیا - تخمیناً تین
ماہ پہلے خداوند کریم نے اس عاجز کو دے دی تھی - چنانچہ یہ خبر بعض
آریوں کو بتلائی بھی گئی تھی - خیر یہ سفر تو ہر ایک کو درپیش ہی ہے -
اور کوئی آگے اور کوئی پیچھے اس مسافر خانے کو چھوڑنے والا ہے - مگر یہ
افسوس ایک بڑا افسوس ہے کہ پنڈت صاحب کو خدا نے ایسا موقع
ہدایت پانے کا دیا کہ اس عاجز کو ان کے زمانے میں پیدا کیا مگر وہ باوصف
ہر طور کے اعلام کے ہدایت پانے سے بے نصیب گئے - روشنی کی طرف
ان کو بلایا گیا - مگر انہوں نے کم بخت دنیا کی محبت سے اس روشنی کو
قبول نہ کیا اور سر سے پاؤں تک تاریکی میں پھنسے رہے - ایک بندہ خدا نے
بار ہا ان کی بھلائی کے لئے اپنی طرف بلایا - مگر انہوں نے اس طرف
قدم بھی نہ اٹھایا - اور یوں ہی عمر کو بے جا تعصبوں اور نخوتوں میں ضائع
کر کے حباب کی طرح ناپدید ہو گئے - حالانکہ اس عاجز کے دس ہزار
روپے کے اشتہار کا اول نشانہ وہی تھے - اور اسی وجہ سے ایک مرتبہ
رسالہ برادر ہند میں بھی ان کے لئے اعلان چھپوایا گیا تھا - مگر ان کی طرف

سے کبھی صدا نہ اُٹھی۔ یہاں تک کہ خاک میں یا راکھ میں جا ملے۔

سو اے بھائیو۔ انہیں پنڈت صاحب کے حال سے نصیحت پکڑو اور اپنے نفسوں پر ظلم نہ کرو۔ سچی نجات کو ڈھونڈو تا کہ اس جہان میں اس کی برکتیں پاؤ۔ سچی اور حقیقی نجات وہی ہے۔ جس کی اس جہان میں برکتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ اور قادر قوی کا وہی پاک کلام ہے کہ جو اسی جگہ طالبوں پر آسمانی راہ کھولتا ہے۔ سو اپنے آپ کو دھوکا مت دو اور جس دین کی حقیقت اسی دنیا میں نظر آرہی ہے۔ اس پاک دین سے روگرداں ہو کر اپنے دل پر تاریکی کا دھبہ مت لگاؤ ہاں اگر مقابلہ اور معارضہ کرنے کی طاقت ہے تو اسی سورہ فاتحہ کے کمالات کے مساوی کوئی دوسرا کلام پیش کرو۔ اور جو کچھ سورۃ فاتحہ کے خواص رُوحانی کی بابت اس عاجز نے لکھا ہے وہ کوئی سماعی بات نہیں ہے۔ بلکہ یہ عاجز اپنے ذاتی تجربہ سے بیان کرتا ہے۔ کہ فی الحقیقت سورہ فاتحہ مظہر انوارِ الٰہی ہے اس قدر عجائبات اس سورۃ کے پڑھنے کے وقت دیکھے گئے ہیں کہ جن سے خدا کے پاک کلام کا قدر و منزلت معلوم ہوتا ہے اس سورہ مبارکہ کی برکت سے اور اس کی تلاوت کے التزام سے کشف مغیبات اس درجے تک پہنچ گیا۔ کہ صدہا اخبار غیبیہ قبل از وقوع منکشف ہوئیں۔ اور ہر ایک مشکل کے وقت اس کے پڑھنے کی حالت میں عجیب طور پر رفع حجاب کیا گیا اور قریب تین ہزار کے کشف صحیح اور رویا صادقہ یاد ہیں۔ کہ جواب تک اس عاجز سے ظہور میں آچکے اور صبح صادق کے کھلنے کی طرح پورے بھی ہو چکے ہیں۔

اور دو سو جگہ سے زیادہ قبولیت دعا کے آثار نمایاں ایسے نازک موقعوں پر دیکھے گئے جن میں بظاہر کوئی صورت مشکل کشائی کی نظر نہیں آتی تھی اور اسی طرح کشف قبور اور دوسرے انواع اقسام کے عجائبات اسی سورۃ کے التزام ورد سے ایسے ظہور پکڑتے گئے کہ اگر ایک ادنیٰ پر تو ان کا کسی پادری یا پنڈت کے دل پر پڑ جائے تو ایک دفعہ حُب دنیا سے قطع تعلق کرکے اسلام کے قبول کرنے کے لئے مرنے پر آمادہ ہو جائے۔

اسی طرح بذریعہ الہامات صادقہ کے جو پیش گوئیاں اس عاجز پر ظاہر ہوتی رہی ہیں جن میں سے بعض پیشگوئیاں مخالفوں کے سامنے پوری ہو گئی ہیں اور پوری ہوتی جاتی ہیں۔ اس قدر ہیں کہ اس عاجز کے خیال میں دو انجیلوں کی ضخامت سے کم نہیں۔ اور یہ عاجز بہ طفیل متابعت حضرت رسول کریم مخاطبات حضرت احدیت میں اس قدر عنایات پاتا ہے کہ جس کا کچھ تھوڑا سا نمونہ حاشیہ در حاشیہ ع۳ کے عربی الہامات وغیرہ میں لکھا گیا ہے خداوند کریم نے اسی رسول مقبول کی متابعت اور محبت کی برکت سے اور اپنے پاک کلام کی پیروی کی تاثیر سے اس خاکسار کو اپنے مخاطبات سے خاص کیا ہے۔ اور علوم لدنیہ سے سرفراز فرمایا ہے اور بہت سے اسرار مخفیہ سے اطلاع بخشی ہے اور بہت سے حقائق اور معارف سے اس ناچیز کے سینہ کو پُر کر دیا ہے اور بارہا بتلا دیا ہے کہ یہ سب عطیات اور عنایات اور یہ سب تفضلات اور احسانات اور یہ سب تلطفات اور توجہات اور یہ سب انعامات اور تائیدات اور یہ سب مکالمات اور مخاطبات بیُمن متابعت و محبت

حضرت خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم ہیں ؎

جمالِ ہمنشیں درمن اثر کرد !
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

اب وہ واعظانِ انجیل اور پادریان گم کردہ سبیل کہاں اور کدھر ہیں کہ جو پرلے درجہ کی ہٹ دھرمی کو اختیار کرکے محض کینہ اور عناد اور شیطانی سیرت کی راہ سے عوام کالانعام کو یہ کہہ کر بہکاتے تھے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے کوئی پیش گوئی ظہور میں نہیں آئی۔ سو اب منصفان حق پسند خود سوچ سمجھ سکتے ہیں کہ جس حالت میں حضرت خاتم الانبیاءؐ کے ادنیٰ خادموں اور کمترین چاکروں سے ہزارہا پیش گوئیاں ظہور میں آتی ہیں اور خوارق عجیبہ ظاہر ہوتے ہیں تو پھر کس قدر بے حیائی اور بے شرمی ہے کہ کوئی کور باطن آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئیوں کے بارے میں ٥ سے انکار کرے اور پادریوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئیوں اس وجہ سے فکر پڑی کہ توریت کتاب استثناء باب ہژدہم آیت بست ودوم میں سچے نبی کی یہ نشانی لکھی ہے کہ اس کی پیش گوئی پوری ہو جائے سو جب پادریوں نے دیکھا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ہزارہا خبریں قبل از وقوع بطور پیش گوئی فرمائی ہیں اور اکثر پیش گوئیوں سے قرآن شریف بھی بھرا ہوا ہے اور وہ سب پیش گوئیاں اپنے وقتوں پر پوری بھی ہو گئیں تو ان کے دل کو یہ دھڑکا شروع ہوا کہ ان پیش گوئیوں پر نظر ڈالنے سے نبوت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی بدیہی طور پر ثابت ہوتی ہے اور یا یہ کہنا پڑتا ہے

کہ جو کچھ توریت میں یعنی کتاب استثناء ۱۸ باب ۲۱ و ۲۲ آیت میں سچے نبی کی نشانی لکھی ہے وہ نشانی صحیح نہیں ہے۔ سو اس پیچ میں آ کر نہایت ہٹ دھرمی سے ان کو یہ کہنا پڑا کہ وہ پیش گوئیاں اصل میں فراستیں ہیں کہ اتفاقاً پوری ہو گئی ہیں لیکن چونکہ جس درخت کی بیخ مضبوط اور طاقتیں قائم ہیں وہ ہمیشہ پھل لاتا ہے۔ اس جہت سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئیاں اور دیگر خوارق صرف اسی زمانے تک محدود نہیں تھے بلکہ اب بھی ان کا برابر سلسلہ جاری ہے اگر کسی پادری وغیرہ کو شک وشبہ ہو تو اس پر لازم و فرض ہے کہ وہ صدق و ارادت سے اس طرف توجہ کرے پھر دیکھے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئیاں کس قدر اب تک بارش کی طرح برس رہی ہیں۔ لیکن اس زمانے کے متعصب پادری اگر خود کشی کا ارادہ کریں تو کریں مگر یہ امید ان پر بہت ہی کم ہے کہ وہ طالب صادق بن کر کمال ارادت اور صدق سے اس نشان کے جویاں ہوں۔ بہرحال دوسرے لوگوں پر واضح رہے کہ جس حالت میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی برکات اب بھی آفتاب کی طرح روشن ہیں اور دوسرے کسی نبی کی برکات کا نشان نہیں ملتا تو اس صورت میں لازم ہے کہ اگر ایسے متعصب اور دنیا پرست پادری کسی بازار یا کسی شہر یا گاؤں میں کسی کو برخلاف اس حق الامر کے بہکاتے نظر آویں تو یہی موقعہ اس کتاب کا ان کے سامنے کھول کر رکھ دیا جاوے کیونکہ یہ کتاب دس ہزار روپے کے اشتہار پر تالیف کی گئی ہے اور اس سے معارضہ کرنے والا دس ہزار روپیہ پا سکتا ہے۔ پس شرم اور حیا سے نہایت بعید ہے کہ جو لوگ نبوت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے منکر ہیں وہ پنڈت ہوں

یا پادری آریہ ہوں یا برہمو۔ وہ صرف زبان سے طریق فضول گوئی کا اختیار رکھیں۔ اور جو دلائل قطعیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور رسالت پر ناطق ہو رہی ہیں ان کے جواب کا کچھ فکر نہ کریں۔ یہ عاجز خواہ نخواہ ان کو دین اسلام کے قبول کرنے کے لئے مجبور نہیں کرتا۔ لیکن اگر مقابلہ و معارضہ سے عاجز رہیں۔ اور جو کچھ آسمانی نشان اور عقلی دلائل حقیت اسلام پر دلالت کر رہے ہیں ان کی نظیر اپنے مذہب میں پیش نہ کر سکیں تو پھر یہی لازم ہے کہ جھوٹ کو چھوڑ کر سچے مذہب کو قبول کر لیں۔

اب پھر ہم اپنی اصل تقریر کی طرف رجوع کر کے لکھتے ہیں کہ جس قدر میں نے اب تک لطائف و معارف و خواص سورۃ فاتحہ لکھے ہیں وہ بدیہی طور پر بے مثل و مانند ہیں مثلاً جو شخص ذرا منصف بن کر اول ان صداقتوں کے اعلیٰ مرتبے پر غور کرے جو سورہ فاتحہ میں جمع ہیں۔ اور پھر ان لطائف اور نکات پر نظر ڈالے جن پر سورہ ممدوحہ مشتمل ہے۔ اور پھر حسن بیان اور ایجاز کلام کو مشاہدہ کرے کہ کیسے معانی کثیرہ کو الفاظ قلیلہ میں بھرا ہوا ہے۔ اور پھر عبارت کو دیکھے کہ کیسی آب و تاب رکھتی ہے اور کس قدر روانگی اور صفائی اور ملائمت اس میں پائی جاتی ہے کہ گویا ایک نہایت مصفیٰ اور شفاف پانی ہے کہ بہتا ہوا چلا جاتا ہے۔ اور پھر اس کی روحانی تاثیروں کو دل میں سوچے کہ جو بطور خارق عادت دلوں کو ظلمات بشریت سے صاف کر کے مورد انوار حضرت الوہیت بناتی ہیں جن کو ہم اس کتاب کے ہر موقعے پر ثابت کرتے چلے جاتے ہیں تو اس پر قرآن شریف کی شان بلند حسب انسانی طاقتیں مقابلہ نہیں کر سکتیں

ایسی وضاحت سے کھل سکتی ہے جس پر زیادت متصور نہیں اور اگر باوجود مشاہدہ ان کمالات کے پھر بھی کسی کور باطن پر عدیم المثالی اس کلام مقدس کی مشتبہ رہے۔ تو اس کا علاج قرآن شریف نے آپ ہی ایسا کیا ہے جس سے کامل طور پر منکرین پر اپنی حجت کو پورا کر دیا ہے اور وہ یہ ہے :۔

وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورۃ

من مثلہ۔ فان لم تفعلوا ولن تفعلوا فاتقوا النار التی

وقودھا الناس والحجارۃ اعدت للکفرین ○

یعنی اگر تمہیں اس کلام کے منجانب اللہ ہونے میں کچھ شک ہے تو تم اس کی کسی سورۃ کی مانند کوئی کلام بنا کر دکھاؤ اور اگر تم نہ بنا سکو اور یاد رکھو کہ ہرگز نہ بنا سکو گے سو اس آگ سے ڈرو جو کافروں کے لئے طیار ہے جس کا ایندھن کافر آدمی اور اُن کے بت ہیں۔ جو نار جہنم کو اپنے گناہوں اور شرارتوں سے افروختہ کر رہے ہیں۔ یہ قول فیصل ہے کہ جو خدائے تعالیٰ نے منکرین اعجاز قرآنی کے ملزم کرنے کے لئے آپ فرما دیا ہے۔ اب اگر کوئی ملزم اور لاجواب رہ کر پھر بھی قرآن شریف کی بلاغت بے مثل سے منکر رہے اور بیہودہ گوئی اور ژاژخائی سے باز نہ آئے تو ایسے بے حیا منقلب الفطرت کا اس دنیا میں علاج نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے وہی علاج ہے۔ جس کا خدا نے اپنے قول فیصل میں وعدہ فرمایا ہے۔

بعض شریر اور کینہ پرور آدمی جنہوں نے ضد اور نفسانیت پر مضبوطی سے قدم مار رکھا ہے اور جن کو تعصب کی تند اندھیری نے بالکل اندھا کر دیا ہے

وہ لوگوں کو یہ کہہ کر بہکاتے ہیں کہ جس قدر لطائف و نکات قرآن کے مسلمان لوگ ذکر کرتے ہیں اور جس قدر خواص عجیبہ اس کے مسلمانوں کی کتابوں میں اندراج پائے ہیں یہ سب انہیں کے فہم کی تیزی ہے اور انہیں کی طبیعتوں کے ایجادات ہیں۔ ورنہ در اصل قرآن لطائف و نکات و خواص عجیبہ سے خالی ہے۔ مگر ایسے لوگ بجز اس کے کہ اپنا ہی حمق اور خبث ظاہر کریں انوارِ قرآنی پر پردہ ڈال نہیں سکتے۔ ان کے جواب میں یہی کہنا کافی ہے کہ اگر مسلمانوں نے خود اپنی ہی زیرکی سے قرآن شریف میں انواع اقسام کے لطائف و نکات و خواص ایجاد کر لئے ہیں اور اصل میں موجود نہیں تو تم بھی اُن کے مقابلے پر کسی اپنی الہامی کتاب یا کسی دُوسری کتاب سے اسی قدر لطائف و برکات و خواص ایجاد کر کے دکھلاؤ اور اگر تمام قرآن شریف کے مقابلہ پر نہیں تو صرف بطور نمونہ سورۃ فاتحہ کے مقابلے پر جس کے کمالات کسی قدر اس حاشیہ میں بیان کئے گئے ہیں کسی اور کتاب سے نکال کر پیش کرو۔ افسوس کہاں سے یہ مادر زاد اندھے پیدا ہو گئے کہ جو اس قدر روشنی کو دیکھ کر پھر بھی ان کی تاریکی دُور نہیں ہوتی۔ ان کی باطنی بیماریوں کے مواد کس قدر ردی اور متعفن ہو رہے ہیں جنہوں نے ان کے تمام حواس ظاہری و باطنی کو بیکار کر دیا ہے۔ ذرا نہیں سوچتے کہ قرآن شریف وہ کتاب ہے جس نے اپنی عظمتوں اپنی حکمتوں اپنی صداقتوں اپنی بلاغتوں اپنے لطائف و نکات اپنے انوارِ رُوحانی کا آپ دعویٰ کیا ہے اور اپنا بے نظیر ہونا آپ ظاہر فرما دیا ہے یہ بات ہرگز نہیں کہ صرف مسلمانوں نے فقط اپنے خیال

ہیں اُس کی خوبیوں کو قرار دے دیا ہے۔ بلکہ وہ تو خود اپنی خوبیوں اور اپنے کمالات کو بیان فرماتا ہے اور اپنا بے مثل و مانند ہونا تمام مخلوقات کے مقابلے پر پیش کر رہا ہے! ور بلند آواز سے ھل من معارض کا نقارہ بجا رہا ہے اور دقائق و حقائق اس کے صرف دو تین نہیں جسمیں کوئی نادان شک بھی کرے۔ بلکہ اس کے دقائق تو بحر زخار کی طرح جوش مار رہے ہیں۔ اور آسمان کے ستاروں کی طرح جہاں نظر ڈالو چمکتے نظر آتے ہیں۔ کوئی صداقت نہیں جو اُس سے باہر ہو۔ کوئی حکمت نہیں جو اُس کے محیط بیان سے رہ گئی ہو۔ کوئی نور نہیں جو اس کی متابعت سے نہ ملتا ہو اور یہ باتیں بلا ثبوت نہیں۔ کوئی ایسا امر نہیں جو صرف زبان سے کہا جاتا ہے بلکہ یہ وہ متحقق اور بدیہی الثبوت صداقت ہے کہ جو تیرہ سو برس سے برابر اپنی روشنی دکھلاتی چلی آئی ہے اور ہم نے بھی اس صداقت کو اپنی اُس کتاب میں نہایت تفصیل سے لکھا ہے۔ اور دقائق اور معارف قرآنی کو اس قدر بیان کیا ہے کہ جو ایک طالب صادق کی تسلّی اور تشفّی کے لئے بحر عظیم کی طرح جوش مار رہے ہیں۔ اب یہ کیونکر ہو سکے کہ کوئی شخص صرف مونہہ کی واہیات باتوں سے اس نور بزرگ کی کسر شان کرے۔ ہاں اگر کسی کے دل کو یہ وہم پکڑتا ہے کہ یہ تمام دقائق و معارف و لطائف و خواص کہ جو قرآن شریف میں ثابت کر کے دکھلائے گئے ہیں کسی دوسری کتاب سے بھی مستخرج ہو سکتے ہیں۔ تو مناظرے کا سیدھا راستہ یہ ہے کہ وہ شرائط مذکورہ بالا کی رعایت سے اس کتاب کے لطائف و

معارف و خواص پیش کرے اور جس طرح قرآن تمام عقائد باطلہ کے رد پر مشتمل ہے اور جس طرح وہ پاک کلام ہر ایک عقیدہ صحیحہ کو دلائل عقلیہ سے ثابت کرتا ہے اور جس طرح ان صحفِ مقدسہ میں معارف و حقائق الٰہیہ مندرج ہیں اور جس طرح ان میں تنویر قلب کے متعلق خواص عجیبہ اور تاثیراتِ غریبہ پائے جاتے ہیں - جن کو ہم نے اس کتاب میں ثابت کر دیا ہے ۔ وہ سب اپنی کتاب میں پیش کر کے دکھلاوے اور جب تک ایسا نہ کرے تب تک کسی کے عوعو کرنے سے چاند کے نور میں کچھ فرق نہیں آ سکتا بلکہ ایسے شخص کی حالت نہایت افسوس کے لائق ہے کہ جواب تک بدیہی صداقت سے بدنصیب اور اور محروم رہنے کے لئے دانستہ ضلالت کی راہوں میں قدم رکھتا ہے۔ ہمارے مخالفوں میں سے کئی صاحب مشہور و نامور ہیں۔ اور جہاں تک ہم خیال کرتے ہیں ان کے علم اور فہم کی نسبت ہمارا یہی یقین ہے کہ اگر انصاف پر آ دیں تو ان صداقتوں کو بدیہی طور پر سمجھ سکتے ہیں ۔ ہماری نیت میں ہرگز نفسانیت کا جھگڑا نہیں ۔ اور بجز اس کے کہ دنیا میں سچائی اور نیکی پھیلائی جائے اور کوئی غرض نہیں۔ اس لئے منصف مزاج ذی علم لوگوں سے یہی درخواست ہے کہ وہ بھی ایک ساعت کے لئے صادقانہ نیت کو استعمال میں لادیں۔ جس حالت میں ان کی فراخ دلی اور نیک طینتی ان کی قوم میں مسلم الثبوت ہے تو ہم کیونکر نا امید ہو سکتے ہیں یا کیونکر گمان کر سکتے ہیں کہ اس نیک منشی کا اس سے زیادہ وسیع ہونا ممکن نہیں۔

اس لئے گو میں نے اب تک کسی صاحب مخالف کو منصفانہ قدم اٹھاتے نہیں پایا لیکن تاہم ابھی تک رائے میری ایک محکم یقین پر قائم ہے اور بہت مضبوط امید سے میں خیال رکھتا ہوں کہ جب ہمارے منصف مزاج مخالفین نہایت غائر اور عمیق نظر سے اس طرف متوجہ ہوں گے تو خود ان کی اپنی نگاہیں ان کے وساوس دور کرنے کے لئے کافی ہوں گی۔ مجھے امید تھی کہ اس کتاب کے حصہ سوئم کے شائع ہونے سے برہمو سماج اور آریہ سماج کے دانشمند اپنی غلطی پر متنبہ ہو کر صداقت حقہ کی طرف ایک پیاسے کی طرح دوڑیں گے۔ مگر افسوس کہ اب میں دیکھتا ہوں کہ میری فراست نے خطا کی اور مجھے اس بات کے سننے سے نہایت ہی دلشکنی ہوئی کہ برہمو صاحبوں اور آریوں نے میری کتاب کو غور سے نہیں پڑھا۔ بالخصوص مجھ کو پنڈت شیو نرائن صاحب کے ریویو کے دیکھنے سے ایک عالم تعصب کا برہمو صاحبوں کی طبیعت میں نظر آیا۔ اور (خدا رحم کرے) افسوس کہ پنڈت صاحب نے ان حقانی صداقتوں سے کہ جو آفتاب کی طرح چمک رہی ہیں کچھ بھی فائدہ نہ اٹھایا اور اس قدر قوی اور مضبوط دلائل کی روشنی سے پنڈت صاحب کی تعصب کی تاریکی کچھ بھی رو بہ کمی نہ ہوئی۔ یہ امر یقیناً سخت حیرت کے لائق ہے کہ ایسے فہیم اور ذی علم لوگ ایسے کامل ثبوت کو دیکھ کر اس کے قبول کرنے میں دیر کریں۔ پنڈت صاحب نے اس انکار سے نہ صرف حد انصاف سے ہی تجاوز کیا ہے بلکہ حق پوشی کر کے اپنی قوم کی ہمدردی سے بلکہ خدا سے بھی فارغ ہو بیٹھے ہیں اور مجھے اس بات کے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ پنڈت صاحب کا انکار کس قدر

ناانصافی سے بھرا ہوا ہے۔ یہ بات خود اس شخص پر کھل سکتی ہے کہ جو اوّل میری کتاب کو دیکھے کہ میں نے کیونکر ضرورت وحی اللہ اور نیز اس کے وجود کا ثبوت دیا ہے۔ اور پھر پنڈت صاحب کی تحریر پر نظر ڈالے کہ انہوں نے میرے مقابلے پر کیا لکھا ہے اور میرے دلائل کا کیا جواب دیا ہے۔ جو لوگ پنڈت صاحب کی قوم میں سے اس کتاب کو غور سے پڑھیں گے۔ ان کی رُوحوں پر ہرگز پنڈت صاحب پردہ ڈال نہیں سکتے۔ بشرطیکہ کوئی فطرتی پردہ نہ ہو ؁

یہ تمام مضمون سیدنا حضرت مرزا صاحب قادیانی (مسیح موعودؑ) کی مشہور کتاب براہین احمدیہ کے صفحہ ۴۲۹ کے حاشیہ ۱۱ سے لے کر صفحہ ۵۶۲ کے حاشیہ نمبر ۱۱ تک مندرج ہے ؁

نقلہٗ بقلم خام
حکیم فاضل شاہ انور قلمکار گجرات

دس شرائطِ بیعت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○ نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

(۱) بیعت کنندہ سچے دل سے عہد اس بات کا کرے کہ آئندہ اس وقت تک کہ قبر میں داخل ہو جائے شرک سے مجتنب رہے گا۔

(۲) یہ کہ جھوٹ اور زنا اور بدنظری اور ہر ایک فسق و فجور اور ظلم اور خیانت اور فساد کے طریقوں سے بچتا رہے گا اور نفسانی جوشوں کے وقت ان کا مغلوب نہیں ہوگا اگرچہ کیسا ہی جذبہ پیش آئے۔

(۳) یہ کہ بلا ناغہ پنج وقتہ نماز موافق حکم خدا اور رسول کے ادا کرتا رہے گا اور حتی الوسع نماز تہجد کے پڑھنے اور اپنے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے اور اپنے گناہوں کی معافی مانگنے اور استغفار کرنے میں مداومت اختیار کرے گا اور دلی محبت سے اللہ تعالیٰ کے احسانوں کو یاد کرکے اس کی حمد اور تعریف کو ہر روز اپنا ورد بنائے گا۔

(۴) یہ کہ عام خلق اللہ کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً اپنے نفسانی جوشوں سے کسی نوع کی ناجائز تکلیف نہیں دے گا۔ زبان سے نہ ہاتھ سے نہ کسی اور طرح سے۔

(۵) یہ کہ ہر حال رنج اور راحت عسر اور یسر اور نعمت اور بلا میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ وفاداری کرے گا اور ہر حالت راضی بقضا ہو گا اور ہر ایک ذلت اور دکھ کے قبول کرنے کے لئے اس کی راہ میں تیار رہے گا اور کسی مصیبت کے وارد ہونے پر اس سے منہ نہیں پھیرے گا بلکہ آگے قدم بڑھائے گا۔

(۶) یہ کہ اتباع رسم اور متابعت ہوا و ہوس سے باز آجائے گا اور قرآن شریف کی حکومت کو بکلی اپنے سر پر قبول کرے گا اور قال اللہ اور قال الرسول کو اپنی ہر ایک راہ میں دستور العمل قرار دے گا۔

(۷) یہ کہ تکبر اور نخوت کو بکلّی چھوڑ دیگا۔ اور فروتنی اور عاجزی اور خوش خلقی اور حلیمی اور مسکینی سے زندگی بسر کریگا۔

(۸) یہ کہ دین اور دین کی عزّت اور ہمدردی اسلام کو اپنی جان اور اپنے مال اور اپنی عزّت اور اپنی اولاد اور اپنے ہر ایک عزیز سے زیادہ تر عزیز سمجھے گا۔

(۹) یہ کہ عام خلق اللہ کی ہمدردی میں محض لِلّٰہ مشغول رہیگا اور جہاں تک بس چل سکتا ہے اپنی خداداد طاقتوں اور نعمتوں سے بنی نوع کو فائدہ پہنچائے گا۔

(۱۰) اس عاجز[1] سے عقدِ اخوت محض للّہ باقرار اطاعت در معروف باندھ کر اس پر تا وقتِ مرگ قائم رہے گا۔ اور اس عقد اخوت میں ایسا اعلیٰ درجہ کا ہوگا کہ اس کی نظیر دنیوی رشتوں اور تعلقوں اور تمام خادمانہ حالتوں میں پائی نہ جاتی ہو۔

میں اپنے تمام مسلمان بھائیوں کی خدمت میں دردِ دل سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ خدارا غور کریں۔ کہ کیا مندرجہ بالا عقاید میں انہیں کوئی ایسا عقیدہ نظر آتا ہے یا شرائط بیعت میں کوئی ایسی شرط نظر آتی ہے جو شریعت غرا کے خلاف ہو اگر جواب نفی میں ہو تو پھر آپ کو حضرت مسیح موعود کی اس جماعت میں شامل ہو کر جو احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور کے نام سے مشہور و معروف ہے خدمت اسلام کے فریضہ کو ادا کرنے میں کیوں تامل ہے یاد رکھیں مسیح موعود کی جماعت میں شامل ہونے کے متعلق حضرت نبی کریم صلعم نے ہر مسلمان کو سخت تاکید کی ہوئی ہے اس پر عمل نہ کرنے والا یقیناً رسول کریم صلعم کا نافرمان ہے۔

خاکسار

شیخ عبدالرحمان مصری

انچارج تنظیم

دعوۃ و تبلیغ احمدیہ انجمن اشاعت اسلام

لاہور

[1] حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی